عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم

طلوعِ اسلام

October-38

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزِ ملت ← [لا الٰہ الا اللہ
محمد رسول اللہ] → مرکزِ ملت

فلا وربک لا یؤمنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یا ایہا الذین اٰمنوا

اعتصموا بحبل اللہ جمیعا و لا تفرقوا
اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو

استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم
بات اللہ اور رسول کی جب تمہیں اس کے لیے بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو

یعنی

مرکز، مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لیے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا — جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں!

علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار
(فرمان رسولؐ)

لا اسلام الا بالجماعۃ
(قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ
با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ
بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی جماعت اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

دہلی

(دورِ جدید)

مرتب
محمد عثمان
جلد (۱)

بدل اشتراک
پانچ روپیہ سالانہ
فی پرچہ ۸ر
شمارہ ۶
بابت اکتوبر ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

۱۔ گہرہائے نایاب	علامہ اقبالؒ کی غیر مطبوعہ رباعی	۳
۲۔ اسلامی نظام	جناب مولانا اسلم صاحب جیراجپوری	۴-۱۷
۳۔ قرآن اور قرآنی دلائل	ادارہ	۱۸-۲۱
۴۔ تفسیر اسرار خودی	جناب خان محمد یوسف خان سلیم چشتی	۲۲-۲۵
۵ امام (نظم)	مولانا اسلم صاحب جیراجپوری	۲۶
۶ حقائق و عبر	جناب رازی	۲۷-۴۰
۷ زبان کا مسئلہ	؍؍ ؍؍	۴۱-۷۷
۸ اشتہارات کتب		۷۸-۸۰

گہرہائے نایاب

حضرت علامہ اقبالؒ کی غیر مطبوعہ رباعی

بمنزل کوش مانندِ مہِ نو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقامِ خویش اگر یابی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو

اسلامی نظام

(از جناب مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری)

قرآن کریم نے ملتِ اسلامیہ کا نظام وحدتِ اطاعت پر رکھا ہے یعنی اس کو سوائے اللہ کے کسی دوسرے کا مطیع نہیں بنایا:۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۱۲/۴۰

کسی کا فرمان نہیں سوائے اللہ کے اُسنے حکم دیا ہے کہ تم سوائے اسکے کسی کے بندے نہ ہو، یہی ہے سیدھا دین. مگر اکثر آدمی نہیں جانتے

وہی بلا شرکت غیرے اصلی حاکم اور مطاع ہے۔

وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖ اَحَدًا ۱۸/۲۶ ÷ اور اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں بناتا

اُسنے بندوں کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی ہدایت اور اُن کی عقلوں کو صحیح راستہ پر لگانے اور اپنی رضامندی اور نارضامندی کے اعمال کو واضح کرنے کے لیے ایک ناقابل تغیر و تبدل کتاب اور مکمل دستور العمل قرآن کریم کو اتار دیا تاکہ اسکے مطابق عمل کرکے لوگ اس کی خالص بندگی کی سعادت حاصل کریں اور دُنیا جہان کی غلامی سے آزاد ہو جائیں ÷

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۶/۱۵۵

اور یہ کتاب جس کو ہمنے اُتارا ہے مُبارک ہے اُس کی پیروی کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو۔ اُمید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

اللہ کی اطاعت کے معنی یہی ہیں کہ اُس کی کتاب کی پیروی کیجائے

أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۱۱۴/۶ ۔

کیا اللہ کے سوا میں کسی اور کو حاکم بناؤں، حالانکہ اللہ تو وہ ہے جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب اتاری ہے ۔

اس کتاب کے سوا کسی دوسرے کی پیروی ممنوع ہے ۔

اِتَّبِعُوْا مَآ أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ أَوْلِيَآءَ ۳/۷

اُسی کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے اور اس کے سوا دوسرے آقاؤں کی پیروی نہ کرو!

چنانچہ جن لوگوں نے دُنیا میں اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت نجات کا ذریعہ سمجھ کر کی ہے وہ قیامت میں جب نتیجہ برعکس دیکھیں گے تو چلا کر کہیں گے ۔

رَبَّنَآ إِنَّآ أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَأَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۔ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۶۸/۳۳

رسالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں ۔

(۱) پیغمبری یعنی پیغامِ الٰہی لوگوں کے پاس بے کم و کاست پہنچا دینا۔ اس حیثیت سے آپ کی تصدیق کرنا اور آپ کے اوپر ایمان لانا فرض کیا گیا۔

(۲) امامت یعنی اُمت کا انتظام، اس کی شیرازہ بندی، اُن کے باہمی قضایا کے فیصلے، تدبیر مہمات جنگ و صلح وغیرہ اجتماعی اُمور میں اُن کی قیادت اور قائم مقامی وغیرہ۔ اس حیثیت سے آپ کی اطاعت اور فرمانبرداری لازم کی گئی ۔

پہلی حیثیت یعنی پیغمبری کے لحاظ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہ تھا بلکہ فریضۂ تبلیغ اللہ کی طرف سے آپ کے ذمہ لازم کر دیا گیا تھا ۔

يٰٓأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۶۷/۵

Blank page

زندگی ہو

یہاں بھی دعا کا صیغہ مفرد ہی اللہ و رسول دونوں کے لیے مستعمل ہوا ہے اور یہ حکم بھی صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے ہے جو آپ کے تمام آنے والے خلفاء پر حاوی ہو

جنگ اُحد میں ہزیمت اُٹھانے کے بعد دوسرے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ غنیم کے تعاقب میں نکلیں۔ یہ حکم چونکہ بحیثیت امام کے تھا اسلیے قرآن میں "اللہ و رسول" دونوں کا حکم کہا گیا:۔

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۳/۱۷۲

جنھوں نے حکم مانا اللہ و رسول کا اپنے زخم اٹھانے کے بعد

اسی طرح حج اکبر کے دن مشرکوں سے برائت کا اعلان جو مرکزِ اسلام کی طرف سے ہوا وہ "اللہ و رسول" دونوں کے نام سے ہوا۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ

اور اعلان ہے اللہ اور اُسکے رسول کی جانب سے لوگوں کی طرف حج اکبر کے دن کہ اللہ اور اسکا رسول مشرکوں سے بری ہے۔

باغیوں اور ڈاکوؤں کو جو مرکز کے مجرم ہیں "اللہ و رسول" دونوں کا محارب قرار دیا گیا

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا ۵/۳۳

جو لوگ اللہ اور اُسکے رسول سے لڑتے اور روئے زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اُن کی سزا بس یہی ہے کہ مار ڈالے جائیں الخ

ان مجرموں کی یہی سزا ہمیشہ کے لیے ہے کچھ عہدِ رسالت ہی تک محدود نہ تھی۔

الغرض بیسیوں آیات ہیں جن میں "اللہ و رسول" کا لفظ مرکز کے معنے میں مستعمل ہوا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اجتماعی لحاظ سے مرکز کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔

دستور العمل: جس طرح اُمّتِ اسلامیہ کی انفرادی زندگی کی اصلاح کے لیے قرآن اُتارا گیا ہے اسی طرح اسکی

اجتماعی زندگی کا بھی دستور العمل وہی ہے وہ ایسی کامل کتاب ہے کہ ہر زمان و مکان اور ہر ماحول میں افراد کی ہدایت اور ملت کی رہنمائی کے لئے کافی ہے اسی لئے جہاں ہر شخص کو ہدایت کیگئی ہے کہ قرآن کی پیروی کرے وہاں مرکز کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے کہ قرآن ہی کے مطابق لوگوں کے درمیان حکومت کرے

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۱۰۵/۴

ہمنے تیرے اوپر حق کے ساتھ کتاب اُتاری ہے کہ جو کچھ اللہ تجھ کو بھلائے اُسکے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کر۔

قرآن کے سوا کسی دوسرے کیطرف رُخ کرنے کی ممانعت کیگئی۔

فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۴۹/۵

اور اُنکے درمیان اسی کے مطابق فیصلے کر جو اللہ نے اُتارا ہے اور اُس حق کو چھوڑ کر اُن کی خواہشوں کے پیچھے نہ چل!

شدید تاکید کیگئی کہ مرکز کو قرآنی تعلیمات سے ذرا بھی غفلت روا نہیں ہے اور نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ اسپر کاربند رہنا چاہیئے۔

فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۴۹/۵

اور یہ کہ تو فیصلے کر اُن کے درمیان اسی کے مطابق جو اللہ نے نازل فرمایا ہے اور اُنکی خواہشوں کے پیچھے نہ جا۔ اور احتیاط رکھ کہ اللہ کے اُتارے ہوئے کسی حکم سے وہ تجھ کو ہٹا کر فتنہ میں نہ ڈال دیں!

یہاں تک کہ یہ وعید بھی کیگئی:-

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۴۷/۵

اور جو اللہ کے اُتارے ہوئے کے مطابق حکم نہ دینگے وہ فاسق ہیں

فریضۂ اطاعت | اسلام کے معنے ہی اطاعت کے ہیں اُمّتِ اسلامیہ کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ و رسول یعنی مرکز کی مطیع رہے۔

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا

کہہ دے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اگر تم روگردانی کروگے تو اس کی ذمہ داری اُسکے اوپر ہے اور تمہاری ذمہ داری تمہارے اوپر ہے اور جو تم اُس کی اطاعت کروگے تو سیدھے راستے پر رہوگے +

مرکز کے وفادار رہو اور اُس سے غداری اور رخنہ فریبی میں خیانت کاری نہ کرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ ۲۷/۸

اے مومنو اللہ و رسول سے غداری اور جانتے ہوئے اپنی امانتوں میں خیانت کرو

مرکز ہی کی اطاعت کامیابی کا ذریعہ ہے۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ ۵۱/۲۴

مومنوں کا قول جب وہ اللہ و رسول کیطرف بلائے جائیں کہ اُنکے درمیان فیصلہ کرے بس یہی ہے کہ کہہ دیں کہ ہمنے سُنا اور مان لیا۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں +

مرکز کے احکام سے سرتابی کرنے والے سب سے زیادہ ذلیل ہونگے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ ۝ ۲۰/۵۸ +

جو لوگ اللہ اور رسول سے مخالفت کرینگے وہ سب سے زیادہ ذلیل لوگوں میں سے ہونگے

مرکز کا حکم قطعی اور آخری ہے کسی مسلمان کو نہ اس سے انکار کا حق ہے نہ اس کا کہیں مرافعہ ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو اپنے معاملہ میں اختیار باقی نہیں رہتا جب کہ اللہ و رسول کسی امر کا فیصلہ کر دے۔

یعنی مرکز ہر دینی یا دُنیاوی امر میں آخری اور بالاترین اختیار ہے جس کی اطاعت کے سوا مسلم کے لیے کوئی

چارہ نہیں اور جس کی نافرمانی گمراہی ہے ۔

اطاعت یہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن سوائے اللہ کے کسی دوسرے کی اطاعت کا حکم نہیں دیتا یہاں تک کہ والدین کا بھی جہاں جہاں ذکر کیا ہے اُن کے ساتھ سلوک اور احسان ہی کی وصیت فرمائی ہے، اطاعت کا حکم نہیں دیا ہے، دینی اطاعت خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی صرف اکیلے اللہ کی ہے انفرادی لحاظ سے قرآن کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور اجتماعی لحاظ سے مرکز کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے جب تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُمّت میں موجود تھے اُنکی اطاعت اللہ کی اطاعت تھی اور آپ کے بعد اس امامت کبریٰ یا آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے جن کا فریضہ یہ ہے کہ کتاب الٰہی کے مطابق احکام نافذ کریں اور اُمّت کے منتخب افراد کو مشاورت کے لیے ساتھ رکھیں یہ احکام قطعی اور حتمی ہونگے جنسے سرتابی کرنیوالا اللہ و رسول کا دشمن ہوگا

الغرض دینِ اسلام محض ایک کتابی مذہب نہیں ہے بلکہ زندگی کا ایک مکمل عملی نظام ہے جو بدقسمتی سے مدتہائے دراز سے مسلمانوں کے ہاتھوں سے کھو یا گیا ہے اور اسی باعث سے وہ غارت ہوئے ہیں کیونکہ کسی ملت کی زندگی جب تک اُسکا زندہ مرکز نہ ہو سخت دشوار ہے ۔

اجتماعی نظام کی پوری شکل اس آیت میں ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ ؁

اے مومنو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی ۔ اور تم میں سے جو امراء ہوں ان کی اطاعت کرو ۔ اگر کسی بات میں تم تنازع کر بیٹھو تو اُس کو اللہ و رسول کیطرف لوٹا دو ۔

یعنی اصل مطاع اللہ ہے اسکی اجتماعی اطاعت ہوگی ۔ رسول یعنی مرکز یا مرکز کے مقرر کیے ہوئے اور اختیار دیے ہوئے مسلم اُمراء کے ذریعہ سے، اُن امراء کا کوئی فیصلہ یا حکم اگر مسلمانوں کو قرآن کے خلاف معلوم ہو تو اُس میں اُن کو اُمراء کے ساتھ منازعت کا حق حاصل ہے اس قسم کے نزاعی اُمور میں مرکز کیطرف رجوع کرنا ہوگا جو اُنکا فوراً قطعی فیصلہ کر دیگا ۔

اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ملت کا سارا اجتماعی اختیار مرکز کے ہاتھ میں ہے۔ اسی کی طرف سے ہر شعبہ کے امراء کا تقرر ہوگا، مثلاً امراءِ ملک، امراءِ فوج، امراءِ عدل، امراءِ حج و ائمہ صلوٰۃ و تعلیم و ارشاد وغیرہ نیز اُس کا یہ بھی فریضہ ہوگا کہ افرادِ ملت و امراءِ ملت کے تنازعات کو مٹاتا رہے اور ان میں باہم کسی قسم کا اختلاف و افتراق پیدا نہ ہونے دے۔ اس انتظامی سلسلہ سے اُمت کا کوئی فرد باہر نہیں نکل سکتا۔

اس نظام میں اربابِ علم و عقل کو فکر کی پوری حریت اور اجتہاد کی مکمل آزادی کے علاوہ قرآن نے درجاتِ عالیہ کی سربلندی بھی عطا کی ہے۔ لیکن ان کو مطاع یا متبوع نہیں قرار دیا، ان کی تحقیق و اجتہاد کے نتائج امت کے لیے اُسی وقت حجت ہونگے جب مرکز سے مسلم ہو کر اس کو ملیں گے۔ اسی طرح واعظوں کو وعظ اور مرشدوں کو رہنمائی کی اسی وقت اجازت ہوگی جب وہ مرکز کا پروانہ رکھتے ہونگے

آخر میں پھر تصریح کر دیتا ہوں کہ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں مرکز کو اللہ و رسول کہتا ہوں، بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی لحاظ سے مرکز ہی کی اطاعت کو قرآن اللہ و رسول کی اطاعت قرار دیتا ہے بشرطیکہ مرکز قرآن کے مطابق ہو۔

میں قرآن کی تشریح کا خود قرآن ہی سے قائل ہوں، اسی بناء پر اللہ و رسول کا یہ مفہوم کہ اُس سے مراد مرکز یعنے امامِ وقت ہے، چند آیات ہی سے واضح کیا ہے جو اہلِ بصیرت کے لیے کافی ہیں اور اگر ضرورت داعی ہوئی تو اور بھی متعدد آیات سے تفصیل پیش کرنے کی گنجائش ہے، مگر عام اہلِ اسلام قرآنی الفاظ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال کی بھی سند چاہتے ہیں اور مدتہائے دراز سے اسکے خوگر ہو رہے ہیں اسلیئے اُن کی تسکینِ خاطر کیواسطے چند ائمہ تفسیر کے اقوال بھی نقل کیے دیتا ہوں جنہوں نے اللہ و رسول کے معنی امامِ وقت ہی کے لکھے ہیں۔

امام ابن جریر طبری سورۂ انفال کی پہلی آیت میں قل الانفال للہ والرسول کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ یہ لکھتے ہیں۔

"واولی ہذہ الاقوال بالصواب فی معنی الانفال قول من قال ہی زیادات یزیدہا الامام لبعض الجیش او جمیعہم

انفال کے معنے کے متعلق ان تمام اقوال میں سے قرین صواب ان لوگوں کا قول ہے جنہوں نے کہا ہے کہ یہ وہ اضافے ہیں جو امام وقت بعض یا کُل فوج کے لیے کرتا ہے۔

یہاں انفال کے معنے سے مجھے بحث نہیں مدعا صرف یہ ہے کہ اللہ و رسول کی تفسیر انھوں نے امام وقت لکھی ہے

امام رازی نے آیت ۳۳؍۵ انما جزآء الذین یحاربون اللہ ورسولہ کے تحت میں امام ابو حنیفہ کا یہ قول نقل کیا ہے :۔

قال ابو حنیفۃ اذا قتل و اخذ المال فالامام مخیر فیہ بین ثلاثۃ اشیاء "

امام ابو حنیفہ نے فرمایا ہے کہ اگر باغی یا ڈاکو نے قتل بھی کیا ہے اور مال بھی لیا ہے تو امام کو اختیار ہے کہ تینوں سزاؤں (قتل قطع اور صلب) میں سے جو سزا چاہے اس کو دے۔

اسی آیت کی تفسیر میں علامہ جلال الدین سیوطی الدر المنثور میں یہ روایت درج کرتے ہیں؛

عن سعید بن المسیب والحسن والضحاک قالوا الامام مخیر فی المحارب یصنع بہ مایشاء "

سعید بن مسیب، حسن بصری اور ضحاک نے کہا ہے کہ محارب کے معاملہ میں امام کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔

یہی امام محی السنۃ بغوی نے معالم التنزیل میں لکھا ہے اور فتح البیان میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں :۔

قال ابن عباس وسعید بن المسیب مجاہد وعطا والحسن البصری وابراہیم النخعی والضحاک ابو ثور من شہر السلاح فی قبۃ الاسلام واخاف السبیل ثم ظفر بہ وقدر علیہ فامام المسلمین فیہ بالخیار"

حضرت ابن عباس، سعید بن المسیب، مجاہد، عطا، حسن بصری، ابراہیم نخعی، ضحاک اور ابو ثور نے کہا ہے کہ جسنے اسلامی محروسہ میں ہتھیار اٹھایا اور راستوں کو پرخطر کر دیا پھر وہ گرفت میں آیا اور پکڑا گیا اُسکے بارے میں مسلمانوں کے امام کو اختیار ہے (جو سزا چاہے دے)

ان اقوال سے دو باتیں ظاہر ہو گئیں ایک تو یہ کہ اللہ و رسول سے مُراد امام وقت ہے اور دوسری یہ کہ یہ احکام آنحضرت صلعم کی ذات یا زندگی تک محدود نہیں تھے بلکہ دائمی ہیں اور یہی دونوں باتیں میں نے آیات سے واضح کی ہیں

تکملہ اس مضمون کے متعلق بعض لوگوں نے زبانی اور بعض لوگوں نے بذریعہ تحریر مختلف قسم کے سوالات کیے جن سے میں نے اندازہ کیا کہ یہ توضیح طلب ہے اسلیے ضروری معلوم ہوا کہ ان میں سے معقول سوالات کو چن کر ترتیب کے ساتھ معہ انکے جوابات کے لکھوں تاکہ مسئلہ کی حقیقت واضح ہو جائے۔

(۱)

س۔ تم کہتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں ایک پیغمبری جسکے ذریعہ سے قرآن ملا۔ دوسری امامت یعنی ملت کی مرکزیت جو آپ کی ذات سے قایم ہوئی اتباع قرآن کی شرعی حیثیت مسلم ہے مگر مرکز تو ایک دنیاوی ادارہ ہے اگر نہ ہو جیسا کہ آج کل ہے تو اس سے مسلمانوں کے اسلام میں کیا خرابی آتی ہے؟

ج۔ بلا مرکز کے ملت کے مقاصد متعین نہیں ہوتے اور نہ اس میں اجتماعی عمل صالح کی حرکت پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ بیابان کے ریگ کے ذروں کی طرح منتشر رہتی ہے جو ہر ہوا اور آندھی کے ساتھ جدھر کو بھی ہوا اڑتی رہتی ہے۔ قرآن امت کا ایمان ہے اور مرکز اس کا اجتماعی عمل۔

قرآن میں اللہ و رسول و اولوالامر کی اطاعت کے احکام جو مسلمانوں کو دیے گئے ہیں، وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ مرکز کی حیثیت بھی شرعی ہے وہ محض دنیاوی ادارہ نہیں ہے ملت امام کے بغیر ایسی ہی ہے جیسے جسم سر کے بغیر جس کا انجام ہلاکت ہے۔

(۲)

س۔ اللہ و رسول و اولوالامر کی اطاعت بلا مرکز کے بھی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ قرآن و سنت اور علما کی اطاعت کی جائے جیسی کہ آج کل ہم کر رہے ہیں۔

ج۔ اور اس کی سزا بھی بھگت رہے ہیں کہ باوجود اپنی کثرت تعداد کے اور باوجود عالم میں اپنی زبردست جغرافی حیثیت کے اور باوجود اسکے کہ اسلام میں تمام تر بہادر اور جنگ آور قومیں داخل ہیں جن کے پشت عظیم الشان تاریخیں ہیں پھر بھی دوسروں سے کمزور اور ذلیل و خوار ہیں بلکہ امت کا بیشتر حصہ شرک اور کفر کا محکوم اور غلام ہے جو اسلام کا جزو صالح نہیں کہا جا سکتا۔ یہ نتیجہ ہے زندہ مرکز نہ ہونے کا اللہ و رسول کی اطاعت کے لیے قرآن و حدیث کو لے لیا کہ جس طرح چاہیں ان پر عمل کریں یا نہ بھی عمل کریں

تو اطاعت کا مطالبہ کرنے والا کون ہے یہ علماء تو انکا حلقہ اثر محدود ہوتا ہے جس سے مرکزیت نہیں پیدا ہو سکتی، علاوہ بریں وہ خود اکثر آپس کی مخالفتوں کیوجہ سے ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق میں مبتلا رہتے ہیں اور اُمت میں اور زیادہ تفریق و انتشار کا موجب ہوتے ہیں، اللہ و رسول کی اطاعت صرف زندہ امام ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے جو ضروریات زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآن کی روشنی میں امت کو اجتماعی مقاصد کیطرف لے چلے

(۳)

س۔ تم نے اللہ و رسول کا مفہوم امام وقت ثابت کیا ہے لیکن علماء اسکے معنے کتاب و سُنت کے سمجھتے ہیں کیا اللہ کے لیے یہ آسان نہ تھا کہ وہ ان دو لفظوں کے بجائے صرف ایک لفظ امام کہہ دیتا تاکہ یہ غلط فہمی نہ ہوتی +

ج۔ قرآنی الفاظ مقصود کے مطابق ہوتے ہیں صرف امام کا لفظ کہنے سے اسلامی مرکز کا صحیح مفہوم نہیں ادا ہو سکتا تھا کیونکہ امام کہتے ہیں پیشرو اور راہبر کو خواہ کسی قسم کا ہو لغوی معنی کے لحاظ سے آج ہٹلر بھی جرمن قوم کا امام ہے لیکن اللہ کو بیان کرنا مقصود ہے اس امام کا جو قرآنی احکام کو نافذ کرنے والا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب امامت کا چلانے والا ہو یہ مفہوم صرف اللہ و رسول ہی کے لفظ سے ادا ہو سکتا تھا جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اُسی کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔

(۴)

س۔ پھر بھی یہ بات حل طلب رہی کہ علماء نے اللہ و رسول سے مرکزِ ملت کیوں نہ سمجھا

ج میں نے اپنے مضمون میں ایسے مفسروں کے نام لکھے ہیں جنہوں نے اللہ و رسول سے امام وقت ہی سمجھا ہے بے شک عرصہ دراز سے استبداد کے تسلط اور جامد تقلید نے علماء کے زاویہ ہائے نگاہ بدل دیئے ہیں وہ دین اسی کو سمجھتے ہیں کہ کتاب و سُنت بلکہ ائمہ کی فقہ پر عمل کرتے رہیں حالانکہ اس سے اجتماعی زندگی نہیں پیدا ہو سکتی، حیات ملی کے لیے قرآن کے ساتھ زندہ امام کی اطاعت بھی ضروری ہے۔

(۵)

س۔ ایک سُنّی مولانا نے کہا کہ کیا ضمانت ہے کہ امام وقت غلطی نہ کریگا۔

ج۔ کیا آپ کے عقیدہ کے مطابق حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما معصوم تھے؟ اگر نہیں تھے تو ان کو خلیفۂ رسول بناتے وقت یہ سوال اُمّت نے کیوں نہیں اٹھایا؟

مگر جواب الزامی ہے، تحقیقی جواب یہ ہے کہ غلط اور صحیح کے جو معنی عرف عام میں ہیں کہ جو حقیقت کے خلاف ہو وہ غلط ہے اور جو حقیقت کے مطابق ہو وہ صحیح ہے وہ نظامِ حکومت اور قانون عدالت میں نہیں ہیں۔ یہاں غلط وہ ہے جو بے ضابطہ ہو اور صحیح وہ ہے جو باضابطہ ہو ہمارے اصولیین بھی یہی کہا کرتے ہیں اگر کسی مقدمہ کا فیصلہ اسلامی قوانین و ضوابط کے مطابق کردے تو چاہے وہ حقیقت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو شرعاً نافذ ہوگا، بلکہ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ القضاء نافذ شرعاً و دیانۃً یعنی نہ صرف شرعاً بلکہ اللہ کے نزدیک بھی۔

ظاہر ہے کہ امامِ اُمّت کا قابل ترین فرد یا بہترین شخصوں میں سے ایک ہوگا جس کے ساتھ قرآن کی روشنی اور مشورہ کے لیے منتخب جماعت بھی ہوگی پھر ساری اُمّت کے ارباب علم و عقل بھی اصلاح کا خیال رکھیں گے ان سب کے بعد بے ضابطگی تو ہو ہی نہیں سکتی اور عرفی غلطی کا بھی خطرہ کم رہ جاتا ہے۔

علاوہ بریں غلطی سے اس قدر خوف کیوں ہے، فطرت نے اس کو انسان کی سرشت میں اس واسطے رکھا ہے کہ وہ زیادہ چوکنا ہوشیار اور خبردار رہے، اس لیے وہ انسان کی ترقی میں معاون ہے اور قصداً نہ ہو تو اس سے جس قدر نقصان ہو جاتا ہے بعض حالتوں میں اس سے زیادہ نفع پہنچتا ہے اور غلطیاں کر کر کے ہی لوگ بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

(۶)

ایک شیعہ بزرگ نے فرمایا کہ مسئلۂ امامت میں تم اسی نقطہ پر آگئے جو ہماری جماعت کا ہے مگر یہ واضح نہیں ہوا کہ امام منصوص ہونا چاہیے جیسا کہ شیعہ کا عقیدہ ہے یا جمہوری جیسا کہ سنی کہتے ہیں۔

ج۔ میں کسی فرقہ بندی کا قائل نہیں ہوں، میں نے جو کچھ لکھا ہے بلا خیال شیعہ یا سنی کے خالص قرآنی

تعلیم کو لکھا ہے میں یہی سمجھ سکا ہوں کہ قرآن جو تمام مسلمانوں کی دینی کتاب ہے، اور سب کے سب بلا استثنا، اس پر ایمان رکھتے ہیں اس کی روشنی میں حسب اقتضائے زمانہ و ضرورت ملّت کو چلانے اور ان سے اطاعت لینے کے لیئے زندہ امام ناگزیر ہے اور بلا اسکے امت کی اجتماعی زندگی کی کوئی صورت نہیں،

رہا امام منصوص کا عقیدہ تو اس کا ثبوت قرآن سے نہیں ملتا۔ اس لیئے میں امام متفق علیہ کا قائل ہوں یعنی جس پر جمہور اُمّت اتفاق کر لے بشرطیکہ یہ ہے کہ وہ قرآن کا تابع ہو اور شوریٰ سے کام کرے +

(۷)

انہوں نے پھر سوال کیا کہ متغلب بھی امام ہو سکتا ہے؟ اور خلفا بنی اُمیّہ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

ج میں کہہ چکا ہوں کہ امام وہ ہے کہ جو قرآن اور اُمت کے شوریٰ کے مطابق کام کرے تغلب بھی اُمت کی شرکت ہی سے ہوتا ہے اس لیئے متغلب بھی امام ہو سکتا ہے بشرطیکہ ملت کا اسپر اتفاق ہو جائے +

خلفا بنی اُمیّہ میں استبداد تھا اور وہ مسلمانوں کے بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے تھے، اس لیئے وہ دُنیاوی بادشاہ تھے، نہ کہ امام، بجز حضرت عمر بن عبد العزیز کے،

(۸)

س۔ کیا ایک زمانہ میں کئی امام ہو سکتے ہیں؟

ج ہرگز نہیں، کیونکہ یہ قرآن کے خلاف ہے نیز اس سے ملّت کی وحدت فنا ہو جائیگی، ہاں امامِ وقت کے ماتحت مختلف اقوام و ممالک میں ہزاروں امام بیک وقت ہو سکتے ہیں یہ قرآنی اصطلاح کے مطابق اولوالامر کہے جائینگے +

(۹)

س۔ موجودہ زمانہ میں امامت نصب کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

ج۔ آج کل ملّت کا صرف ۱/۱۰ حصہ آزاد ہے اور ۹/۱۰ غیروں کا محکوم۔ نصب امام آزاد مسلم قوموں کا فریضہ ہے اور خوشی کی بات ہے کہ ان کا رُخ بھی اسطرف معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرکز قایم کریں۔

(۱۰)

س۔ ہم ہندوستانی مسلمانوں کو اس صیغہ میں کیا کرنا چاہیئے۔ اور امام نہ رکھنے کی وجہ سے تم ہم کو مسلمان بھی سمجھتے ہو یا نہیں؟

ج۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہم محکوم ہیں اور ہمارے اوپر وہ قوانین نافذ ہیں جو حکمراں قوم نے بنائے ہیں ایسی حالت میں ہم یہی کرسکتے ہیں کہ باہمی اختلافات کو چھوڑ کر قرآن کی طرف آئیں اور وحدت عمل پیدا کریں اور چاہے ہم میں کتنی ہی جماعتیں اور جمعیتیں ہوں، لیکن ایک مرکزی انجمن جو آئین کے ماتحت ہو متفقہ طور پر تمام ملت کے لیے ضروری ہے جس کا رکن ہر ہندی مسلم کو ہونا چاہیئے۔ ملت کے اس باہمی ربط سے آئیندہ کے لیے راستے کھلیں گے۔

باقی رہا ہندوستان کے مسلمانوں کے اسلام یا کفر کا سوال تو میں اس قسم کے فتوؤں کو نارو اجرأت سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہاں جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے وہ مسلمان ہے اور جو نہ کہے وہ نہیں ہے میں خود بھی ہندوستان ہی کی اپنے آپ کو مسلمان کہنے والی جماعت کا فرد ہوں۔ جو سب کا حال ہے وہی میرا حال ہے۔

وَمَا اَنَا اِلَّا مِنْ غَزِيَّةَ۔ اِنْ غَوَتْ
غَوَيْتُ۔ وَاِنْ تَرْشُدْ غَزِيَّةُ اَرْشُدِ

وارد ہا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان

وارد ہا کی تعلیمی اسکیم پر جناب رازی کا یہ عظیم الشان تبصرہ اب کسی تبصرہ کا محتاج نہیں رہا۔ کئی کئی ہزار کے دو ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ اب تیسری بار چھپ کر شائع ہوا ہے اور نصف سے زائد نکل چکا ہے اسے خود بھی پڑھیئے اور دوسروں کو بھی پڑھ کر سنایئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ "قومی حکومتوں" کے دور میں مسلمانوں کو مذہب سے بیگانہ رکھنے اور ان پر ہندو تہذیب کو مسلط کرنے کی کیسی ترکیب ایجاد کی گئی ہے۔ قیمت فی نسخہ ایک آنہ محصول ۱؍

(منیجر طلوع اسلام بلیماران دہلی)

قرآن اور قرآنی دلائل

(گزشتہ سے پیوستہ)

(از ادارہ)

مذہب کی جڑ اور ایمان کی بنیاد خدا کے وجود کا اقرار ہے اسی لیئے ہر مذہب والے نے پہلے اسی مسئلہ پر غور و فکر کیا ہے متکلمینِ اسلام کو جب دہریوں اور خدا کے منکروں سے سابقہ پڑا تو انکو خدا کے وجود پر دلائل قایم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ اُنھوں نے وجود باریتعؐ پر دلائل قایم کیئے اور ان دلائل کو یا تو اپنے دماغ سے اختراع کیا یا فرفوریوس اور ارسطو کے کلام سے اخذ کیا اور اس تگ و دو میں انکو خیال ہی نہ رہا کہ قرآنِ حکیم وجودِ صانع پر خود کیا دلائل قایم کرتا ہے اور اُسکے مقدمات کس قدر یقینی اور اقرب الی الفہم ہیں، مثلاً ملاحظہ فرمایئے۔

متکلمین کی اختراعی دلیلیں

یُونانی فلاسفہ نے تسلیم کیا ہے کہ عالم کا سلسلہ منتہی ہے اور اسکی ایک علت ہے جو اسکی پیدایش اور تخلیق کا سبب ہے، اُسپر ارسطو نے یہ دلیل قایم کی تھی کہ عالم متحرک ہے اور ہر متحرک کے لیئے محرک کا ہونا ضروری ہے اسلیئے عالم کا بھی کوئی نہ کوئی محرک ہوگا جس کو خدا یا علت العلل کہنا چاہیئے یہ دلیل ایسی ہے کہ کوئی سلیم العقل اس کو تسلیم نہیں کرسکتا ایک دہریہ کہہ سکتا ہے کہ حرکت مادّی ذرات کا خاصہ ہے۔ اسلیئے حرکت خودبخود پیدا ہوجاتی ہے متکلمینِ اسلام نے جب دیکھا کہ اس دلیل سے کام نہیں چلتا تو اُنھوں نے صانع عالم پر ایک دوسری دلیل قایم کی اُس کو سمجھنے کے لیئے اُمورِ ذیل ذہن نشین کرلینے چاہیئں۔

(۱) عالم جوہر و عرض یا صفت و موصوف کے مجموعہ کا نام ہے، اور یہ دونوں حادث ہیں۔

(۲) اعراض کا حدوث بدیہی ہے، سکون کے بعد حرکت اور حرکت کے بعد پیدایش روزمرّہ کا مشاہدہ

ہے اعیان یا جواہر کے حدوث کی وجہ یہ ہے کہ انکے ساتھ اعراض پائے جاتے ہیں۔

(۳) جو چیز حادث کا محل ہو وہ خود حادث ہوتی ہے لہٰذا جواہر و اعیان بھی حادث ہیں۔

اسکے بعد متکلمین یہ دلیل قایم کرتے ہیں کہ عالم حادث ہے لہٰذا اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہوگا اور وہی خدا ہے! ابن رشد فلسفی نے اس دلیل کے پرخچے اڑا کر یہ زبردست خدشہ وارد کیا ہے کہ اسکا کیا ثبوت ہے کہ جو چیز اعراض کا محل ہے اُس کا حادث ہونا ضروری ہے ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ اعراض بےشک حادث ہونگے لیکن نفسِ محل حادث نہ ہوگا کیونکہ اگر کسی چیز پر پے درپے اعراض وارد ہوتے رہیں تو اُسکے محل کا حادث ہونا لازم نہیں آتا اسکے بعد ابن رشدؒ کہتا ہے کہ:۔

"ولو کلف الجمهور العلم من هذه الطرق لکان من باب تکلیف مالا یطاق و ایضاً فان الطرق التی سلك هؤلاء القوم فی حدوث العالم قد جمعت بین هذین الوصفین معاً اعنی ان الجمهور لیس فی طباعهم قبولها ولا هی مع هذا برهانیة فلیست تصح لا للعلماء ولا للجمهور۔

اگر ان طریقوں سے عوام کو علم کے لیے مکلف گردانا جائے تو یہ تکلیف مالا یطاق کی قبیل سے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہوگا، نیز اُن لوگوں نے حدوث عالم کے بارے میں جو طریقے اختیار کیے ہیں وہ دو اوصاف کے جامع ہیں یعنی ان دلائل کو نہ تو عوام سمجھ سکتے اور نہ انکو قبول کر سکتے ہیں اور نہ وہ فی نفسہ برہانی اور یقینی ہیں لہٰذا وہ نہ علماء کے لیے مفید ہیں اور نہ عوام کے لیے۔[1]

جب متکلمین کی یہ دلیل بیکار ثابت ہوئی اور اسکا ضعف خود انپر بھی واضح ہو گیا تو انھوں نے وجود صانع پر ایک اور دلیل قایم کی اور امکان و وجوب کے پردہ میں اپنی خفت کو مٹانا چاہا چنانچہ انھوں نے فرمایا کہ عالم، ممکن ہے یعنی جائز العدم اور جائز الوجود ہے۔ اسلیئے وہ ایک ایسی ہستی کا محتاج ہے جو اسکا مرجح اور مخصص ہو اور وہ مرجح خدا ہے۔

---

[1] دیکھو ابن رشد کی کتاب کشف الادلہ ص۴۲ مطبوعہ مصر ۱۲

مگر خدا کے وجود پر یہ دلیل بھی نہایت کمزور ہے اور جو شبہات اس پر وارد ہوتے ہیں انکا جواب متکلمین کے بس کا نہیں ہے۔

اگر متکلمین کے دلائل سے خدا کا وجود ثابت بھی ہو جائے تب بھی وہ دلیلیں ایک مسلمان کے لیے ایک خدا پرست کے لیے اور اس شخص کے لیے جو خدا کی ذات و صفات کا صحیح تصور پیدا کرنا چاہتا ہے قطعاً ناقابل قبول ہیں کیونکہ ان دلائل سے جس "خدا" کا ظہور ہوتا ہے وہ محض خیالی، ذہنی اور ناکارہ ہے ان دلائل سے یہ کہاں ثابت ہوگیا کہ وہ خدا فاعل مختار، فعال لما یرید ہے جامع الصفات والکمالات ہے۔ قادر و علیم ہے، سمیع و بصیر ہے، خالق و ناصر ہے، اور رحمٰن و رحیم ہے؟ خدا کی معرفت حاصل کرنے والوں کو ہرگز ایسے خدا کی ضرورت نہیں جو محض ذہنی اور اعتباری ہو اور انسان کو اس سے کوئی اُنس اور محبت پیدا نہ ہو، یاد رکھیے خدا کا مسکن قلبِ مومن ہے، دماغِ فلاسفر نہیں ہے۔

قرآن اور صانع عالم

لیکن قرآن حکیم نے باری تعالیٰ یا خالقِ کائنات کے وجود مقدس پر جو دلائل قایم کیے ہیں ان سے خود بخود

(۱) اذعان و یقین کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) ہر عامی اور جاہل کو تسلی حاصل ہو جاتی ہے۔

(۳) اور خود بخود ان سے ایک ایسے خدا کے وجود کا پتہ چل جاتا ہے جو صفات حسنہ کا جامع اور کمالات و حسنات کا سرچشمہ ہے ایسا خدا جو قلبِ انسانی کو تسکین و طمانیت کے نور سے بھر دیتا ہے۔

اب آیئے قرآن حکیم کی طرف اور دیکھیے کہ وہ اپنے دعوے پر کس طرح دلیل قایم کرتا ہے اور اسکے مقدمات کس قدر بسیط اور سہل ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے خدا کے وجود پر تین طرح کے دلائل قایم کیے ہیں

اوّل۔ وہ منافع کائنات سے دلیل لاتا ہے اور انسان کو کائنات میں غور و تدبر کی دعوت دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ تمام عالم نوع انسانی کے فائدہ کے لیے بنایا گیا ہے اگر اسکا بنانیوالا کوئی صاحبِ حکمت صاحب ارادہ اور علیم و خبیر نہ ہو تو یہ چیز اس سے حاصل نہیں ہو سکتی

الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر ○

کیا جنے تمام عالم پیدا کر دیا وہ علم سے خالی ہو سکتا ہے؟ بلا شبہ وہ تو لطیف اور خبیر ہے

چنانچہ فرمایا:۔

(۱) وآیۃ لھم الارض المیتۃ احییناھا واخرجنا منھا حبًا فمنہ یاکلون ○ وجعلنا فیھا جنٰت من نخیل واعناب وفجرنا فیھا من العیون ○ لیاکلوا من ثمرہ وما عملتہ ایدیھم افلا یشکرون ○

اور ان کے لیئے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ ہم مُردہ زمین کو از سرِ نو زندہ کر دیتے ہیں۔ اور اس سے دانے نکالتے ہیں اور وہ اسکو کھاتے ہیں اور ہم اس میں کھجور اور انگور کے باغ لگا کر چشمے بھی جاری کر دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی محنت کا نتیجہ دیکھیں اور پھل کھائیں۔ ان نعمتوں پر آخر وہ کیوں سپاس گزار نہیں ہوتے؟

(۲) الذین یتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض ربنا ما خلقت ھٰذا باطلاً

جو لوگ زمین و آسمان کی پیدائش میں غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے مربی! تو نے انکو عبث اور بے فائدہ پیدا نہیں کیا

(۳) فلینظر الانسان الیٰ طعامہٖ انا صببنا الماء صبًا ○ ثم شققنا الارض شقًا ○ فانبتنا فیھا حبًا ○ وعنبًا وقضبًا ○ وزیتونًا ونخلًا ○ وحدائق غلبًا ○ وفاکھۃ وابًا ○ متاعًا لکم ولانعامکم ○

انسان ذرا اپنے کھانے کی طرف تو دیکھے ہم نے اس پر پانی چھڑکا۔ پھر زمین کو پھاڑ کر اس میں سے غلہ انگور اور ترکاری پیدا کی اور زیتون اور کھجور بھی اسی کے ساتھ لہلہاتے باغ اور ان میں پھل پھول پیدا کیئے جو تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لیئے متاعِ زندگی ہیں

دوم۔ قرآن حکیم مخلوقات کی پیدائش سے خالق کے وجود پر بھی استدلال کرتا ہے +

(۴) اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوٰت والارض وما خلق اللہ من شیءٍ

(باقی آئندہ)

تفسیر اسرارِ خودی!

مبحث ششم

(از جناب خان محمد یوسف صاحب سلیم چشتی بی اے آنرز)

یہ مضمون میں نے اپنے دوست سید محمد شاہ صاحب ایم اے کی فرمائش پر لکھنا شروع کیا تھا اور اس کی پانچ قسطیں اُنکے رسالہ "پیغام حق" میں شائع بھی ہوئیں، لیکن بعض وجوہ سے یہ رسالہ بند ہو گیا۔ اسلیئے اب میں یہ سلسلہ رسالہ طلوع اسلام میں جاری کر رہا ہوں۔

یہ مضمون علامہ مرحوم کی مایۂ ناز تصنیف اسرارِ خودی کو مسلمانوں سے متعارف کرنے کی ایک ابتدائی حقیر سی کوشش ہے، اور اسکا مقصد علامہ کے فلسفہ کی تشریح نہیں ہے، بلکہ اس کو اُردو زبان میں پیش کرنا، تاکہ مسلمانوں کی توجہ اس اہم کتاب کیطرف مبذول ہو سکے، اس کتاب کی تشریح و توضیح، ایک مستقل کتاب کی صورت میں پیش کیجائے گی۔

یہ مضمون رسالہ طلوعِ اسلام میں باقاعدہ ہر ماہ شائع ہو گا جسمیں کہ اسرار خودی اور رموزِ بیخودی دونوں مثنویوں کے مطالب بطرز اجمال ناظرین کے سامنے آجائینگے۔ ہرچند یہ قسط عنوان مذکورہ صدر کی چھٹی کڑی ہے لیکن چونکہ اصل مسئلہ یہی ہے کہ خودی کیا ہے اور اسکا استحکام و تربیت کس طرح ہو سکتی ہے اس لیئے اس کڑی کے آغاز سے بھی سلسلہ غیر مربوط نہیں رہے گا۔

مراحل سہ گانہ

جب یہ ثابت ہوگیا کہ ترقی اور کامیابی تمامتر استحکام و تربیت خودی پر منحصر ہے تو اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ خودی کی تربیت کس نہج اور کس صورت سے کیجائے۔

علامہ نے اسکا جواب یہ دیا ہے کہ تربیتِ خودی کے تین مراحل (A G E S) ہیں مرحلۂ اوّل کا نام اطاعت ہے۔ مرحلۂ دوم کا نام ضبطِ نفس ہے اور مرحلۂ سوم کا نام نیابت الٰہی ہے۔ ذیل میں ان مراحل سہ گانہ کی تشریح درج کیجاتی ہے۔

مرحلۂ اوّل

اگر کوئی شخص اپنی خودی کی تربیت کا خواہاں ہے تو اُسے سب سے پہلے اطاعت کو شعارِ زندگی بنانا چاہیے۔ اور فرائض منصبی کے ادا کرنے کو مقصدِ حیات سمجھنا چاہیے۔

واضح ہو کہ اطاعت اور ادائے فرض دونو کا مطلب ایک ہی ہے۔ لہذا مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ اطاعت (فرمانبرداری) تربیت خودی کے لیئے پہلی اور لازمی شرط ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کس شخص کی فرمانبرداری یا اطاعت کیجائے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کی۔

کس طرح؟ قرآن مجید خدا تعالےٰ کا عطا کردہ دستور العمل ہے اور دستور العمل کی اطاعت ہی دراصل خدا کی اطاعت ہے۔

<u>ایک شبہ کا ازالہ</u> اس جگہ یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید میں کئی جگہ مسلمانوں کو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے یہ کیوں؟ اسکا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کی اطاعت کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس دستور العمل کی اطاعت کیجائے جو آپنے دنیا کو دیا۔

نوٹ۔ اسلام شخصیت پرستی سے بالاتر ہے، وہ انسان کو خدا پرستی کی تعلیم دیتا ہے، اور مسلمان صرف خدا کے حکم کا پابند ہے۔ رسول کا حکم بھی خدا کا حکم ہوتا ہے اور آیہ قرآنی من یطع الرسول فقد اطاع اللہ اسپر دال ہے۔ مسلمان آنحضرتؐ کے نام پر جان قربان کرنا سعادت سرمدی یقین کرتا ہے مگر اسلیئے نہیں کہ آپ فلاں ابن فلاں کے بیٹے تھے۔ بلکہ اسلیئے

کہ آپ نے ہمیں قرآن مجید جیسی نعمت عطا کی۔

مسلمان اپنے ہادی برحقؐ کو نہ خدا سمجھتے ہیں نہ خدا کا فرزند بلکہ عبدہٗ و رسولہٗ۔ اور واضح ہو کہ عبد اور عبدہٗ میں زمین و آسمان کا فرق ہے، یہ وہ بلند مقام ہے جس کی رفعت کا اندازہ بھی دشوار ہے علامہ خود لکھتے ہیں۔

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر　　ما سراپا انتظار او منتظر

اب یہ اشعار پڑھیے۔

تو ہم از بار فرائض سر متاب　　برخوری از عندہٗ "حسن المآب"

یعنی جس طرح اشترِ صحرائی کمال صبر و استقلال کے ساتھ اپنے فرائض منصبی کو ادا کرتا ہے اسی طرح اے انسان، تو بھی ادائے فرض میں کوتاہی نہ کر۔ اگر تو اپنے فرائض کو اچھی طرح ادا کرے گا اور اطاعت کو اپنا شعار زندگی بنائے گا تو یقیناً اللہ تعالیٰ تجھے اسکا اجرِ عظیم عطا فرمائے گا جیسا کہ اُسنے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝

(زن و فرزند دولت مال اور ثروت دنیوی) یہ سب چیزیں دنیا کی زندگی کی پونجی ہیں اور اللہ کے پاس (حیات انسانی کا) بہترین مقصد موجود ہے

در اطاعت کوش اے غفلت شعار　　می شود از جبر پیدا اختیار

یعنی اے غفلت شعار! اطاعت الٰہی میں سرگرمی دکھا کیونکہ جبر ہی سے اختیار پیدا ہوتا ہے

FREEDOM IS BORN OUT OF OBEDIENCE TO THE DIVINE LAW

فلسفہ جبر و اختیار

حکیم الامتہ نے اس شعر میں ایک زبردست زندگی بخش حقیقت کا انکشاف فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ اگر مسلمان حکومت کے طالب ہیں تو انہیں۔ اطاعت (الٰہی) کو اپنا شعار بنانا چاہیئے

می شود از جبر پیدا اختیار

مغربی اور مشرقی دونوں ممالک کے فلاسفہ اور حکمار میں صدیوں سے یہ بحث چلی آرہی ہے کہ انسان مجبور ہے یا مختار؟ گزشتہ ڈہائی ہزار سال میں جو کچھ اسپر لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ تین آرا میں منحصر کیا جاسکتا ہے:۔

(ا) انسان مجبور محض ہے

(ب) انسان مختار ہے۔

(ج) انسان مختار بھی ہے مجبور بھی ہے

علامہ نے ان تینوں قیاسات سے بچ کر ایک نئی بات پیش کی ہے جو اُن کی ذہانت و بلند فکری، جدّت طرازی اور اجتہادِ فکر کی ایک روشن دلیل ہے، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جبر و اختیار کی بحث کو اس طرح سُلجھایا ہے کہ بے اختیار مرحبا کہنے کو دل چاہتا ہے۔

ابتدائے آفرینش سے یہ سوال انسان کے ذہن میں پیدا ہوتا چلا آیا ہے کہ میں مجبور ہوں یا مختار؟ علامہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ ہر انسان حالت جبر یہ پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ پیدا ہونا ہی مجبوری کی دلیل ہے۔

لیکن اگر وہ اپنے دل پر جبر کر کے، اطاعتِ الٰہی اختیار کرے، تو انجام کار یہ رنگ اطاعت اس میں شان اختیار پیدا کر دیگا

ہر انسان فطرتاً مختاری و حکمرانی کا آرزو مند ہے علامہ نے اپنے فلسفہ میں اُسے تکمیل آرزو کا نہایت سادہ اور یقینی طریقہ بتا دیا ہے کہ اگر تم حکومت (اختیار) کے آرزو مند ہو تو خدائی دستور العمل (قرآن مجید) کی اطاعت کرو۔ صاحبِ اختیار ہو جاؤ گے، گویا اول اطاعت بعد کو حکومت

اس شعر میں جو جبر و اختیار کے لفظ آئے ہیں اُن کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں جو میں نے اوپر بیان کیے یعنی اختیار بمعنی حکومت اور جبر بمعنی اطاعت۔

ایک سوال

اب سوال یہ ہے جبر سے اختیار کیونکر پیدا ہو سکتا ہے؟ (باقی آئندہ)

امام

(از جناب مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری)

عروج پا نہیں سکتی جہاں میں وہ ملّت — کہ جسکا کوئی نہ مرکز ہو اور نہ کوئی نظام
ہو اگرچہ ریگ بیاباں کیطرح لاتعداد — ہوا کے جھونکوں میں اُڑتی پھرے گی صبح و شام
اگر ہو نظم تو ملّت ہے آہنی دیوار — کہ جسکے سامنے طوفاں کو بھی نہیں ہے قیام
یہ نظم کیلئے ہے فقط ایک نقطۂ مرکز — زبانِ شرع میں جس کو کہا گیا ہے امام
ہیں اجتماعی مقاصد اسی سے وابستہ — امام زندہ ہے ملّت کی زندگی کا قوام

جہاں کی دوسری قوموں کا نسب ہے مدار — مگر ہے ملّتِ اسلام جامع الاقوام
اساس اسکی ہے لبس "لا الٰہ الا اللہ" — اسی اساس پہ قائم ہوئی اخوتِ عام
نہ کوئی نسل، نہ کوئی زبان، نہ کوئی ملک — ہے امتیازِ سیاہ و سفید و سرخ حرام
ہے اسکے ربط میں قوموں کا ارتباط بہم — ہے اسکے نظم میں دنیا کی اُمتوں کا نظام
یہ کیا غضب ہے کہ مسلم کو یہ نہیں معلوم — سپرد کیگئی اس کو امامتِ اقوام
امامِ ملّتِ اسلام نائبِ حق ہے — تمام اہلِ جہاں جسکے حکم کے ہیں غلام

اگر ہے دینِ محمدؐ کا پاس اُمّت کو
تو آج نصبِ امام ہے اسکا پہلا کام

حقائق و عبر

(ادارہ)

مسلمانوں کی تنظیم

طلوعِ اسلام اس مسلک کے پیشِ نظر جاری کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ سے متعلق ہر اہم مسئلہ کا حل قرآن کریم کی روشنی میں پیش کرے۔ الحمدللہ علیٰ ذٰلک کہ توفیق ایزدی اُسنے دورِ حاضرہ کے سیاسی مباحث کے متعلق اسوقت تک جو کچھ لکھا ہے اُسنے اربابِ فکر و نظر کی توجہات کو پھر اس نقطہ کیطرف مرکوز کرنا شروع کر دیا ہے کہ فی الواقع مسلمانوں کے ہر شعبۂ حیات میں قرآن کریم ہی انکا خضرِ راہ بن سکتا ہے اس ضمن میں ہم ابتداء سے قومیت پرست حضرات کی خدمت میں گزارش کر رہے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے مسلمانوں کو اتنا تو بتا دیں کہ اس دورِ انتشار و خلفشار میں سیاسی مسالک کی بابت قرآن کریم مسلمانوں کو کون سی راہ دکھاتا ہے۔ لیکن جیسا اندیشہ تھا۔ ان حضرات میں سے کسی نے اس گزارش کو تاحال درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ غالباً اس وجہ سے کہ اُنکے نزدیک سیاست کو مذہب سے کوئی علاقہ نہیں۔ ورنہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو لوگ رفع یدین اور آمین بالجہر جیسے مسائل کو اتنی اہمیت دیں کہ آئے دن اُنکے متعلق مباحث و مناظرات منعقد ہوں۔ اور مقدمہ بازیوں تک نوبت پہنچ جائے وہ اِس اہم مسئلہ کی ضرورت محسوس نہ کریں اور یہ نہ سوچیں کہ کتاب و سنت کی روشنی میں سیاستِ حاضرہ میں مسلمانوں کا مسلک کیا ہونا چاہیے۔

جن رسائل نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے۔ ان میں سے ایک رسالہ کا مضمون "مسلمانوں کی تنظیم" پر ہماری نظر سے گزرا ہے۔ جس میں گو طلوعِ اسلام سے براہ راست خطاب نہیں۔ لیکن اسلوب بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ مضمون کے پیشِ نظر ہمارے مضامین تھے۔ بہرحال چونکہ مضمون مذکور

طلوعِ اسلام کے مسلک کی تردید میں ہے اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان غلط فہمیوں کو دور کر دیں جو اس مضمون کی اشاعت کی محرک معلوم ہوتی ہیں اور جن کی بنا پر وہ اپنے ہم مسلک حضرات کو بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن انکے ساتھ ہے!

صاحبِ مضمون نے سب سے زیادہ زور اس بات کو ثابت کرنے میں صرف فرمایا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ جس مسلک کے ساتھ اکثریت ہو وہی مسلک حق و عدل کا ہوتا ہے انکے نزدیک ایسی تنظیم جسکے لیے بھیڑ کا لفظ زیادہ موزوں ہوتا ہے کبھی حق پر نہیں ہوتی، اس بنا پر وہ ان لوگوں کو جو مسلمانوں کے الگ "جماعتی نظام" کو از روئے قرآن کریم ضروری قرار دیتے ہیں یہ طعن دیتے ہیں کہ حیرت ہے کہ اگر کوئی اس غوغائے عام میں شریک نہیں تو آپ اسے غدارِ ملت، خائنِ قوم، فی الدرک الاسفل من النار کا مستحق اور من شذ شذ فی النار کا مستوجب قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اسکے جماعت ہونے کی آپکے پاس بڑی دلیل صرف یہ ہے کہ اس کی تعداد زیادہ ہے"۔ اسکے بعد سورۂ مائدہ کی ایک آیت سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ جو مسلک اکثریت کا ہو وہی حق کا مسلک ہوتا ہے۔

ہم اگر چاہتے تو بطورِ الزامی جواب کے وہ تمام اسناد پیش کرکے جن میں "سوادِ اعظم" کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے، دریافت کر سکتے تھے کہ ان دلائل میں وہ کس طرح تطبیق دینگے لیکن چونکہ ہمارا مقصد مناظرہ نہیں۔ اسلیے ہم اس طریقِ فکر و نظر سے مجتنب ہو کر افہامِ حقیقت کیطرف رجوع کرتے ہیں۔

طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ:-

(۱) مسلمان دنیا میں ایک مستقل قومیت (جماعت) کی حیثیت رکھتے ہیں جس کا مدار وطن، نسل، رنگ، زبان کی وحدت پر نہیں، بلکہ وحدتِ افکار و اعمال پر ہے جسے ایمان و عملِ صالح کہتے ہیں۔

(۲) مسلم و غیر مسلم ملکر ایک متحدہ قومیت کے اجزا نہیں بن سکتے کیونکہ قومیت کے لیے از روئے اسلام وجۂ جامعیت ایمان ہے اور غیر مسلم اُسے کہتے ہیں جو دولتِ ایمان سے بے بہرہ ہو۔

(۳) مسلمان من حیث الجماعت اپنے مرکز کی قیادت میں غیر مسلموں سے برّ و تقویٰ کے کاموں میں

میثاق و معاہدہ کی رُو سے اشتراکِ عمل کر سکتے ہیں۔

(۷) مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ سے متعلق تمام معاملات کا فیصلہ باہمی مشورہ سے ہوگا اور ان فیصلوں کی تنفیذ مرکز کیطرف سے ہونی چاہیئے۔

(۵) مسلمانانِ ہند کا اولیں فریضہ اس قسم کی جماعت کا قیام ہے کیونکہ اسکے بغیر اُن کی زندگی اسلامی زندگی نہیں۔

اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ اس مسلک کو اکثریت کی تائید حاصل ہے۔ مگر ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ کتاب و سنّت کی رُو سے صرف یہی راستہ صراط مستقیم ہے اس دعویٰ کے ثبوت میں طلوعِ اسلام قرآن و سنّت برابر پیش کر رہا ہے جو قومیت پرست مسلمان اس مسلک کو غلط سمجھتے ہیں وہ خدارا قرآن و سنّت سے اپنے دعوے کے اثبات میں کوئی دلیل پیش کریں ورنہ جو ہماری دلیل نہیں اُسکے بُطلان میں اتنی کاوش۔ اور جن دلائل پر ہمارے دعوے کی بُنیاد ہے اُن سے اغماض، صحیح طریق استدلال نہیں۔

صاحبِ مضمون نے شرکت کانگریس کے جواز میں ایک ایسی دلیل پیش کی ہے جسے دیکھ کر بے حد تاسف ہوا اس کا بیان کرنا صرف اس لیئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ کانگریس میں شامل ہونے والے حضرات کے پاس اپنے مسلک کی تائید میں کس قسم کے دلائل ہیں؛ سورۂ مائدہ میں ہے کہ جب حضرت موسےٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لیکر فلسطین کیطرف بڑھے تو اُن سے کہا کہ یہ وہ مُلک ہے جسے اللہ تعالےٰ نے تمہارے لیئے مقدر کر رکھا ہے۔ لہٰذا بے دھڑک اس میں داخل ہو جاؤ۔ اُسنے غلبہ و استیلا تمہارے لیئے لکھ دیا ہے۔ فرمایا۔

یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ۝ قَالُوْا یٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى یَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۔ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَیْهِمُ الْبَابَ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۝ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ ۵ / ۲۱-۲۳

اے میری قوم داخل ہو جا اس مقدس سرزمین میں جو اللہ نے تیرے لئے لکھ دی ہے اور قدم پیچھے نہ ہٹاؤ کہ تم نامرادوں میں ہو جاؤ۔ بولے اے موسیٰ اس میں طاقتور لوگ ہیں۔ اور ہم اس میں داخل نہ ہوں گے، تاآنکہ وہ وہاں سے نکل جائیں پس وہ اگر اس سے نکل گئے تو ہم اس میں داخل ہونگے، دو آدمیوں نے جوان میں سے تھے جو اللہ سے ڈرتے تھے جن دونوں پر اللہ نے انعام کیا تھا۔ کہا دبیدھڑک داخل ہو جاؤ پس جب تم داخل ہو جاؤ گے تو تم ہی غالب رہو گے اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم سچے مومن ہو۔

چونکہ ان آیات میں "داخل ہو جاؤ" کے الفاظ آئے ہیں اس لئے اس سے ان حضرات کو سند مل گئی کہ "کانگریس میں داخل ہو جاؤ" تفسیر ملاحظہ فرمایئے:۔

"ان آیتوں کو خوب غور سے پڑھو۔ حضرت موسےٰ اپنی قوم سے فرماتے ہیں کہ فلسطین میں داخل ہو جاؤ لیکن ساری قوم پر جبن و بزدلی کی موت طاری ہے وہ جواب دیتی ہے کہ عمالقہ طاقتور ہیں تعداد میں زیادہ ہیں، انکے پاس مال و زر ہے۔ ہم داخل ہوئے اور وہ ہم کو نگل گئے، پس اس وقت تک ہم اس سرزمین کیطرف قدم بھی نہ بڑھائیں گے جب تک یہ موجود ہیں ہاں یہ نکل جائیں گے تو ہم داخل ہو سکتے ہیں۔ دیکھو پوری قوم کا دل خوف سے بیٹھ چکا ہے صرف ایک چھوٹی سی جماعت زندہ ہے۔ ان میں سے صرف خدا کے دو بندوں میں ایمان اور زندگی کی پوری حرارت موجود ہے چونکہ وہ خدا سے ڈرتے ہیں (یخافون) اس لئے انسانوں کے ڈر سے چاہے ان کی تعداد کتنی ہی ہو انکے دل آشنا نہیں ہیں۔ قوم کی عام گمراہی کے باوجود ان کو راہ حق معلوم ہے (انعم اللہ علیہما) یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن میں منعم علیہم اس جماعت کو کہا گیا ہے جو صراط مستقیم پر ہو، اس کی شرح طولانی ہے، قوم کی اس بزدلی اور گمراہی پر انکا ایمان جوش میں آجاتا ہے، وہ پکارتے ہیں کہ اے لوگو! بزدل مت بنو، آگے بڑھ کر داخل ہو جاؤ۔ تعداد کی کثرت اور سروسامان کی قوت مت ڈھونڈو خدا پر بھروسہ کرو اسکا بھروسہ ہی اصل قوت ہے۔

قرآن مجید کا اعجاز دیکھو وہ کس طرح ہماری زندگی کے تمام گوشوں کے لیے اپنے اندر ہدایت رکھتا ہے اور کس طرح اس نے بنی اسرائیل کی زندگی کی یہ سرگزشت ہمارے لیے محفوظ کر دی کہ جو ہزاروں برس کے بعد بھی ہمارے حالات پر اس طرح منطبق ہو رہی ہے گویا آج ہی کی حکایت ہے

جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

آؤ آج کے حالات کا تجزیہ کرو!

(۱) تمہارے سامنے بھی ہمت آزمائی اور عمل کا ایک میدان ہے جس میں اگر داخل ہو جاؤ تو فتحمندی تمہارے ہی لیے ہے۔

(۲) لیکن اکثریت کے خوف اور اُسکے سامان اور روپیہ کی کثرت نے تم کو سراسیمہ کر دیا ہے۔ اس لیے عزم و ہمت سے محروم ہو کر تم پست ہمتی کی خاکِ مذلت پر لوٹ رہے ہو۔

(۳) صرف تھوڑے ہیں جو زندہ ہیں اسلئے کہ وہ اللہ سے ڈرتے ہیں پس انسانوں کا خوف کبھی ان کو نہیں ڈراتا۔

(۴) اور اُن میں سے شاید دو ہی ہیں جو غیرت و حمیت ایمانی کا اصل جوش رکھتے ہیں اور انپر اللہ کا انعام ہے۔ اسلیئے ایک پُوری بھیڑ کے غوغا نے بھی اُن کی راہ گم نہیں کی ہے۔

(۵) وہ تعداد کی کثرت اور سر و سامان کی فراوانی سے زیادہ اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں اس لیے کہ وہ سچے مومن ہیں۔ اور پورا یقین رکھتے ہیں کہ اگر ہم نے عزم و ہمت کے ساتھ قدم بڑھائے تو آخر کی فتحمندی ہمارے ہی لیئے ہے۔

اب ایمانداری کے ساتھ فیصلہ کرو کہ یہاں قرآن کس کے ساتھ ہے؟ بہت بڑی بھیڑ کے ساتھ جو خوف و ہراس کے بستر پر دم توڑ رہی ہے یا عزم و ہمت کے ان دو داعیوں کے ساتھ جو وقت کے غوغائے عام میں اپنی راہ دیکھ رہے ہیں اور بے دھڑک اسی کی طرف لوگوں کو بلا رہے ہیں، اگر تم تو ان کو من شذ شذ فی النار اور فی الدرک الاسفل من النار کی وعید سناتے ہو کہ وہ تمہاری جماعت سے الگ ہو گئے۔ ان ھذا الشئ عجیب۔

یہ ہے شرکت کانگریس کی دلیل۔ اب قرآن کریم کی ان آیات کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ بات کیا تھی۔ اور اس سے نتائج کیا نکالے جا رہے ہیں۔ بات یہ تھی کہ :-

(۱) بنی اسرائیل کے لیے ارض مقدس کو اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا تھا۔

(۲) اپنے دو رسولوں کی معرفت یہ پیغام اُن تک پہنچا دیا تھا۔

(۳) بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ بڑھے چلو۔ وہاں کے باشندوں سے لڑائی کرو۔ فتح تمہاری ہو گی۔

(۴) وہ دو بزرگ جو قوم کو اس راستہ کیطرف دعوت دیتے تھے، خدا کے رسول تھے جنکو اللہ تعالیٰ سے اس غلبہ و نصرت کی بشارت مل چکی تھی۔

اسکے مقابلہ میں ہمارے کانگریس پرست عالم قرآن کے نتائج مستخرجہ ملاحظہ ہوں۔ وہ فرماتے ہیں۔

(۱) اس سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ اکثریت سے نہ ڈریں اور کانگریس میں بے دھڑک شامل ہو جائیں۔

(۲) شرکت کانگریس کے بعد فتح اِن کی ہوگی۔

(۳) وہ دو انسان جن کو (نعوذ باللہ) مثیل موسیٰ و ہارون ٹھیرایا گیا ہے۔ غالباً ان سب سے لوگ واقف ہوں گے۔ اِن سے پُوچھیئے کہ :-

(۱) اللہ تعالیٰ نے کیا بنی اسرائیل سے یہ کہا تھا کہ جا کر اہل فلسطین کی اکثریت سے محبت اور دوستی کے تعلقات پیدا کرو اور دونوں ملکر ایک متحدہ قومیت بنجاؤ! یا یہ کہا تھا کہ ...... من حیث القوم اپنے مرکز کی زیر قیادت قوم مخالف کے مقابلہ کیغرض سے ارض مقدس میں داخل ہو جاؤ۔

(۲) کیا اللہ تعالیٰ نے قوم پرست مسلم حضرات کو کہیں یہ وعدے دے رکھا ہے، کہ تم ہندوؤں سے ملکر ایک متحدہ قومیت بنالو پھر فتح تمہارے لیے مقدر کر دی گئی ہے؟

(۳) کیا اِن ہر دو مولانا حضرات کو اللہ تعالیٰ نے ایسا الہام بھی کیا ہے کہ یہ متحدہ قومیت ہی مسلمانوں کے لیے صحیح راہِ عمل ہے؟

(۴) کیا یہ ہر دو حضرات کانگریس میں شامل ہو کر خدا کی اطاعت کیطرف دعوت دے رہے ہیں یا

ہندوؤں کی اطاعت کیطرف بلا رہے ہیں؟ یہ تو ظاہر ہے کہ کانگریس کے جمہوری نظام کے ماتحت ان حضرات پر کانگریس کے فیصلوں کی اطاعت لازم ہے، جو دوسرے معنوں میں ہندوؤں کی اکثریت کے فیصلے ہیں۔ اس لیے مسلمان اگر ان کی اطاعت کریں تو کیا یہ بالواسطہ ہندوؤں کی ہی اطاعت نہ ہوگی؟

یہ ہے نمونہ اِن حضرات کی قرآن فہمی کا۔

اگر یہ حضرات سورۂ مائدہ کی انہی آیات سے استدلال کرنا چاہتے ہیں تو وہاں تو اس قوم کو حکم تھا کہ عمالقہ سے لڑائی کرو، اس کے بعد وہاں اپنی حکومت قائم کرو، سو یہ قومیت پرست حضرات ذرا جرأت دکھائیں اور متفقہ طور پر یہ اعلان کر دیں کہ "شرکت کانگرس سے ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ ہندوؤں سے ہر طریق پر جنگ کیجائے اور انہیں ذمی بنا کر ہندوستان میں خالص اسلامی حکومت قائم کیجائے"۔

فیصلہ آپ پر ہے کہ ہمت آزمائی اور عمل کے میدان میں اکثریت کے خوف اور اسکے سامان اور روپیہ کی کثرت نے کس کو سراسیمہ کر رکھا ہے کون عزم و ہمت سے محروم ہو کر پست ہمتی کی خاکِ مذلت پر لوٹ رہا ہے کون ہے جسے صرف اللہ کا خوف ڈراتا ہے اور انسانوں کا خوف کبھی نہیں ڈراتا۔ ہندوؤں کے ساتھ ملنے والوں کی یہ حالت ہے یا انکے مقابلہ میں اپنی جماعت کی تنظیم کرنے والوں کی؟ دیکھنا یہ ہے کہ غیرت و حمیت ایمانی کا اصل جوش ان دو حضرات میں "جو اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اور جنپر اللہ نے اپنا انعام کر رکھا ہے"۔ مذکورۂ بالا اعلان کی توفیق پیدا کرتا ہے یا اکثریت کے سامان اور روپیہ کی کثرت ان کو سراسیمہ کر دیتی ہے"؟

پھر ایمانداری کے ساتھ فیصلہ ہو جائیگا کہ قرآن کس کے ساتھ ہے؟

اس رسالے کے ہم مشرب ایک اور رسالہ نے طلوعِ اسلام پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"لیکن جمہور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے مذہب اور سیاست دونوں میں خصوصاً مذہبی پہلو سے۔ اسکے (طلوعِ اسلام کے) خیالات و معتقدات خالص جماعتی اور عام مسلمانوں کے مسلک سے

بالکل علیحدہ ہیں۔"

یعنی۔ ایک صاحب تو فرماتے ہیں کہ:۔

"طلوعِ اسلام کا مسلک جمہور کا مسلک ہے لیکن چونکہ یہ ضرور نہیں کہ جمہور کا مسلک ہمیشہ حق و عدل کا مسلک ہو اسلئے طلوعِ اسلام کا مسلک غلط ہے۔

لیکن اُنکے ہم مشرب دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

طلوعِ اسلام کا مسلک جمہور اسلام کا مسلک نہیں ہے اور چونکہ صحیح مسلک جمہور کا ہوتا ہے اس لیے طلوعِ اسلام کا مسلک صحیح نہیں۔

حالانکہ طلوعِ اسلام کا مسلک صرف کتاب و سُنت کا مسلک ہے۔

مؤخر الذکر رسالہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"بے شک اسلام ایک مستقل قومیت ہے لیکن اُسے اتنا محدود کر دینا کہ اسلام اور مسلمانوں کے فائدے کے لیے بھی غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کی گنجائش باقی نہ رہے نہ اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح ہے اور نہ مسلمانوں کے لیے مفید۔"

یعنی:۔ اسلام ایک مستقل قومیت ہے اور کفر ایک الگ قومیت } اور ان دو مختلف قومیتوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قومیت کا وجود عمل میں آسکتا ہے!

ہمیں معلوم نہیں کہ ان سے یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ "جماعتی نظام" کے قرآنی تصور سے غیر مسلموں کے ساتھ نیک کاموں میں اشتراکِ عمل کی گنجائش باقی نہیں رہتی، ہم تو کتاب و سنت کو یہ سمجھے ہیں اور اسکے لیے ہمارے پاس دلائل و براہین موجود ہیں کہ اسلام ہیئت اجتماعیہ سے متعلق بِر و تقویٰ کے معاملات میں غیر مسلموں سے من حیث الجماعت اشتراکِ عمل کی اجازت دیتا ہے، مگر انفرادی طور پہ کفار کی جماعتوں میں شامل ہو کر اور اس طرح ایک "متحدہ قومیت" بنا کر اشتراکِ عمل کی اجازت نہیں دیتا۔ ہم اول الذکر اشتراکِ عمل کے زبردست حامی اور آخر الذکر قسم کے اشتراکِ عمل کے سختی سے مخالف ہیں۔ اگر کوئی صاحب اسکے خلاف ثابت کر سکتے ہوں۔ تو فاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

ہم ان حضرات کی خدمت میں گزارش کرینگے کہ وہ از خود ایک مسلک متعین کر کے قرآن کریم کو اس پر ڈھالنے کی کوشش نہ فرمائیں بلکہ قرآن کریم کو سامنے رکھیں اور جس مسلک کیطرف وہ رہنمائی کرے، صرف اسپر گامزن ہوں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ایک مدت کی فرقہ سازی، گروہ بندی، تحزب و تشیع، لامرکزیت اور انفرادیت نے مسلمانوں کی نگاہوں سے "جماعتی" اور مرکزی نظام کو اوجھل کر دیا ہے اور چونکہ جماعتی نظام سے وہ تمام گروہ بندیاں ٹوٹتی نظر آتی ہیں جن میں امت تقسیم ہو رہی ہے اس لیے وہ حضرات جو اپنے اپنے دائروں کے مرکز بنچکے ہیں، اس تصور سے ڈرتے اور کانپتے ہیں، اور مسلمانوں کو اسطرف آنے سے طرح طرح کے خوف دلاتے ہیں۔ کیونکہ یہ کبھی دیکھ نہیں سکتے کہ انکے خود ساختہ طلسم ٹوٹ جائیں۔ لیکن قرآن کریم کے عصائے موسوی کے سامنے "سحر کی یہ رسیاں" کب تک نظر فریب بنتی رہیں گی۔ ہم تو دیکھ رہے ہیں کہ

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا !
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

یہ مضمون پریس میں جا چکا تھا کہ مؤقر معاصر صدق لکھنؤ، بابت ۱۱ ستمبر ۱۹۳۸ء میں ذیل کا شذرہ محولہ بالا مضمون "مسلمانوں کی تنظیم" پر ہماری نظر سے گزرا۔ جسے ہم شکریہ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

حیدرآباد دکن سے علوم مشرقی و مغربی کے جامع ایک فاضل اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

پچھلے ہفتہ اخبار ... میں رسالہ ..... سے ایک مضمون تنظیم کے عنوان سے نقل ہوا ہے مضمون کا حاصل یہ ہے کہ آج کل مسلمان جو تنظیم کر رہے ہیں وہ ہنود اکثریت کے خوف پر مبنی نہیں ہے یہ غیر اللہ کا خوف ہے، حالانکہ مسلمانوں کا نظم خوف خدا پر مبنی ہونا چاہیے چند آیات کی تشریح اس روشنی میں کیگئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کانگریس میں غیر مشروط شرکت کی دعوت دینے والے دو اصحاب (غالباً مولانا ... اور ..... کیطرف اشارہ ہے، کو موسیٰؑ اور ہارونؑ کی جگہ اور انکے نقش قدم پر کام کرنے والا قرار

دیا گیا ہے۔"

یہ عجیب و غریب منطق و تاویل ہے، کانگرس کا کام اور ساری تنظیم برطانوی شہنشاہیت کے خطرات کے خلاف ہے، گویا برطانوی شہنشاہیت کے خطرات پر کام مبنی ہو تو عین حق پرستی، حالانکہ یہ بھی غیر اللہ ہی ہے لیکن اگر برطانوی طاغوت اور ہنود مشرکین دونوں فتنوں کے خلاف کوئی جماعت منظم ہو تو یہ بے دینی ہے شرک خفی ہے غیر اللہ سے خوف زدہ حقیقتہً کون ہے؟ جو بلا شرط مشرکین سے موالات پر آمادہ ہو جائے، یا وہ جو سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرے؟ قرآن مجید میں فتنۂ ظالمین سے نجات کی جو دعائیں ہیں، یا قوم کفار سے نجات کی جو استدعا درج ہے انکا کیا منشا ہے؟ خود قانون جہاد کفار و مشرکین کے فتنوں کے خلاف منظم ہو کر کام کرنے کے سوا اور کیا مفہوم رکھتا ہے؟ مولانا.... رح کے تفسیری کارناموں کی اشاعت کا اہتمام کرنے والوں کے قلم سے قرآن مجید کی یہ تفسیر کس درجہ حیرت اور افسوس پیدا کرنے والی ہے"!

---

(۲) سنی لیگ

لکھنؤ میں ایک سنی لیگ کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ ہمیں اس سے تو غرض نہیں کہ یہ لیگ کس بناء اور کس غرض سے قایم کیجا رہی ہے لیکن ہم کارکنان لیگ کے سامنے ایک اہم سوال رکھنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ ہندوستان کا ایک سب سے بڑا مسلم رئیس جو خود سنی تہا اور جسکے آباء و اجداد سنی تھے۔ اپنی تفضیلیت کا اعلان کرتا ہے جو دراصل اس کی شیعیت کا پردہ ہے، امراء کا جا تر عوام پر ہے وہ ظاہر ہے اس لیے اس لیگ کا فریضہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اسکے اس عقیدہ کی مخالفت کرے۔ ہم منتظر ہیں کہ دیکھیں یہ حضرات اس مسئلہ میں مداہنت اور چشم پوشی سے کام لیتے ہیں یا اعلائے کلمۃ الحق کرتے ہیں۔

---

(۳) جمعیت تحفظ ناموس اسلام

اسی طرح مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی نے الحاد و بے دینی کو روکنے اور ناموس اسلام کے تحفظ کے لئے ایک جمعیت علماء و فضلاء کے قیام کی تجویز پیش کی ہے ہم حضرت مولانا کی خدمت میں گزارش کرینگے کہ اگر یہ جماعت وجود میں آجائے تو سب سے پہلے اسکے سامنے وہ مسئلہ رکھا جائے جو آج ہندوستان کے مسلمانوں میں اس طرح باہمی تفریق و تشتت کا موجب بن رہا ہے۔ یعنی کانگریسی اور مسلم لیگی خیالات میں اختلاف آراء اگر اسلام میں دین و سیاست ایک چیز ہے' تو ان حضرات کو سب سے پہلے متعین کرنا چاہیئے کہ مسلمانوں کے لیے صحیح راستہ کون سا ہے ورنہ یہ اعلان کر دیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں

ہم اس مسئلہ میں اس جماعت کے سامنے رکھنے کی تجویز اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ اول تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس جماعت کے عناصر ترکیبی میں مختلف خیالات کے حضرات کو یکجا کرنے کی تجویز ہے دوسرے یہ کہ ناموس اسلام کے خلاف آج سب سے بڑا حملہ خود مسلمانوں کے اس نوجوان طبقہ کیطرف سے ہو رہا ہے جو قومیت پرستی کی آڑ میں اشتراکیت روس کے دلدادہ ہو چکے ہیں' اور اس طرح الحاد و بیدینی کی علانیہ تبلیغ کر رہے ہیں اور بدبختی سے قومیت پرست علماء کا طبقہ سیاسی مسلک میں اُن کی یک جہتی کے باعث، انکے خلاف بالعموم لب کشائی نہیں کرتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے مولانا دریاآبادی ہم سے زیادہ واقف ہیں۔ اگر سیاسی مسلک میں مسلمانوں کے اختلاف آراء کا کسی طرح فیصلہ ہو جائے تو ناموس اسلام کے تحفظ میں بہت سی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔

---

(۴) مذہب اور سیاست

طلوع اسلام کئی بار اس حقیقت کا انکشاف کر چکا ہے کہ سیاست حاضرہ میں مسلمانوں کے لیے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اپنوں اور بیگانوں کیطرف سے یہ بات اُنکے ذہن نشین کرائی جا رہی ہے کہ مذہب ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام ہے' سیاسی معاملات میں اسکا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے"

چنانچہ حال ہی میں مسٹر ولبھائی ڈیسائی نے شملہ میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا :۔

"اب یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ایسا نظام قایم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کرلیں۔ اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ ضمیر اور مذہب اور خدا کو اُنکے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رہنے دیا جائے اور انہیں زمین کے معاملات میں خواہ مخواہ نہ گھسیٹا جائے ..... اس چیز کا تو اب تصور بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاست کے ساتھ ملا دیا جائے تو کوئی نظام حکومت قایم ہوسکتا ہے یا جذبہ حبّ الوطنی محض قومیت پرستی کی بنا پر پرورش پاسکتا ہے ..... یعنی اس ماتر بھومی سے وابستہ ہوجانے سے جسنے تمہیں پیدایش اور زندگی عطا کی ہے اور جو مرنے کے بعد بھی تمہیں آغوش میں لے گی ..... عہد حاضر میں بہترین نظام حکومت کی بنا، اس نظریہ پر قایم ہوسکتی ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے سے منسلک ہوکر ایک متحدہ قومیت بنجائیں۔" (ہندوستان ٹائمز $\frac{9}{8}$ ۵)

---

(۵) مذہب وتصوف

سیاست کو مذہب سے الگ کرنے کے لیے جو "معصوم و مقدس" کوششیں ہو رہی ہیں، اس ضمن میں یوگ (تصوف) کو نمایاں کرکے سطح پر لایا جارہا ہے کیونکہ یہی وہ سانچہ ہے جس میں اکبر کا دینِ الٰہی۔ اور دَورِ حاضرہ کا برہمو سماج ایک نئی شکل اختیار کرکے متحدہ قومیت کا مذہب بن سکے گا۔ پچھلے دنوں شملہ کے آریہ سماج مندر میں ایک مذاکرہ علمیہ ..... (DEBATE) کا انعقاد ہوا۔ عنوان یہ تھا کہ :۔

"ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ اس ہندو مسلم اتحاد پر مبنی ہے۔ جس کی اساس یوگ

موافقین نے اس امر پر زور دیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں صرف وہ مذہب اتحاد و یگانگت کا ضامن ہو سکتا ہے جو دینِ الٰہی کی شکل کا ہو اور جس میں اہنسا کی تعلیم بطور روح کے کام کر رہی ہو۔ مخالفین میں نوجوان طبقہ تھا اور انکا مطمح نظر یہ تھا کہ مذہب خواہ کتنی ہی معصوم شکل میں کیوں نہ ہو ہندوستان کی ترقی کے راستے میں ایک زبردست روڑا ہے، جب تک اُسے خارج البلد نہیں کیا جائیگا، ہم کبھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔

اس قسم کے مذاکرات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہوا کا رُخ کدھر کو ہے اور بتدریج غیر محسوس طور پر ذہنیتوں میں کس قسم کی تبدیلی واقع ہو رہی ہے، نوجوان طبقہ تو ایک طرف رہا، پچھلے دنوں نواب سر اکبر حیدری نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں اپنے خطبۂ صدارت کے دوران میں فرمایا کہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے "مذہب کا مفہوم سمجھنے کی کوشش صرف تصوف اور روحانیت کی وساطت سے کرنی چاہیے اور ظواہر رسوم کو مذہب نہیں سمجھنا چاہیے"۔ (نگار اگست ۱۹۳۶ء)

دیکھیے۔ وار دہا کے "بجلی گھر" سے جو برقی رو نکلتی ہے وہ کس طرح ہر کہ و مہ کو اندر ہی اندر متاثر کیے جاتی ہے۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے اگلے دنوں جمعیت العلماء کی اہمیت بتاتے ہوئے فرمایا تھا کہ اگر علماء نہ رہے تو تمہاری نماز روزے کس طرح باقی رہیں گے (تقریر لائلپور) لیکن انہیں کون بتائے کہ جب مذہب ہی اس قسم کا ہو جائے گا تو نماز روزے کی ضرورت ہی کہاں رہے گی اے کاش! یہ حضرات کہیں ان طوفانوں کو بھی محسوس کر سکیں جو ہندوستان سے قصرِ اسلام کو بہالے جانے کی فکر میں ہیں۔

---

(۶) ہند دلنوازی

شملہ کا ذکر آگیا تو وہاں کے ایک اور جلسہ کی تصویر بھی ہماری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ ۹ ستمبر کو تعلیم کے عنوان پر مسٹر ستیا مورتی کی تقریر تھی۔ اور مسٹر آصف علی جلسہ کے صدر تھے۔ جب وہ کرسئ صدارت کو مزین فرمانے کے لیے تشریف لائے تو انکا حسبِ معمول تالیوں سے "سواگت" ہوا اسکے جواب میں انہوں نے

ہاتھ جوڑ کر گردن جھکائے ہوئے پرنام کیا۔ پھر اپنی صدارتی تقریر میں (اُردو میں) فرمایا کہ "ٹیچر کا بڑا درجہ ہوتا ہے" "تم کرائسٹ۔ بُدھ۔ محمدؐ کو بھی ٹیچر ہی کہتے ہو، مہاتما گاندھی بھی اسی قسم کے ٹیچر ہیں" اُنھوں نے گاندھی کے نام کے ساتھ تو مہاتما کے تعظیمی الفاظ کی ضرورت سمجھی لیکن سرورِ کائنات نبی اکرمؐ (فداہ ابی وامی) اور دیگر بانیانِ مذاہب کے ناموں کے ساتھ کسی تعظیمی لفظ کی ضرورت محسوس نہ کی۔ پھر یہ بھی کہا کہ مہاتما گاندھی ہمیں اٹھارہ برس سے ان سچائیوں کی **تعلیم دے رہے** ہیں جن کی وجہ سے ہم آج اتنے بلند ہوگئے ہیں ان کو قطعاً یاد نہ آیا کہ آج سے چودہ سو برس پیشتر فاران کی چوٹیوں سے بھی ایک نورانی شمع روشن ہوئی تھی۔ جس نے انسانیت کو اتنا بلند کر دیا تھا کہ آسمان کی رفعتیں بھی اسکے سامنے سرنگوں ہوگئی تھیں، اور جس کی درخشندگی اور تابندگی کا یہ عالم ہے کہ ظلمت کدۂ عالم میں جہاں کہیں روشنی کی کوئی کرن نظر آتی ہے وہ اسی سراجِ مُنیر سے کسبِ ضیا کرتی ہے۔ ہم ان حضرات سے صرف اتنا عرض کرینگے کہ اور تو سب کچھ چھوڑ ایسے مخلوط مجمعوں میں مسلمانوں کے جذبات کا ہی کچھ احترام کر لیا کریں کہ

آخر گنہ گار ہیں کافر نہیں ہیں یہ

اطلاع دیجیے

چونکہ ڈاکخانہ کی کوتاہیوں کے باعث بہت سی شکایات آئی ہیں کہ خریداروں کو ستمبر کا پرچہ نہیں ملا حالانکہ دفتر سے کمال احتیاط کے ساتھ پرچے وقت پر روانہ کیئے گئے تھے اسلیے خریداروں کی خدمت میں گزارش ہے کہ اگر انہیں وقت پر پرچہ نہ ملے تو آٹھ روز کے اندر اندر پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع دفتر کو دیں تاکہ رسالہ دوبارہ ان کی خدمت میں ارسال کر دیا جائے۔ آٹھ روز کے بعد دفتر کے لیے کسی حکم کی تعمیل ناممکن ہوگی۔ رسالہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(مینجر)

زبان کا مسئلہ[1]

(راؔدی)

"واردھا اسکیم" والے مضمون[2] میں ہم بصراحت لکھ چکے ہیں کہ اس آئینی تبدیلیوں کے زمانہ میں ہندوؤں کے پیشِ نظر سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ جوں جوں ملک کی حکومت ان کے ہاتھ میں آتی جائے وہ ایسی تدابیر اختیار کریں جن سے ہندوستان میں مسلمان من حیث القوم زندہ نہ رہ سکیں۔ مسلمانوں کا الگ قومی تشخص انہیں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے کیونکہ ہندوستان میں جتنی قومیں باہر سے آئیں اور جنہوں نے یہاں بود و باش اختیار کی ان میں سے صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جسے یہ "اکال الامم" اپنے اندر جذب نہیں کر سکا ورنہ انکے علاوہ سب کے سب رفتہ رفتہ یہاں پہنچکر ہندو ہو گئے۔ مسلمانوں کی انفرادیت مٹانے کے لئے ہندو پوری قوت سے سرگرمِ عمل ہے اور اس کے لئے اس نے طریق کار وہ اختیار کیا ہے جسے ہم نے دریا کی پرسکون روانیوں سے تشبیہ دی تھی۔ میدانِ سیاست میں ایک "متحدہ قومیت" کی تشکیل کا حسین تصور پیش کیا جا رہا ہے اور اس کے بھیانک اور خطرناک نتائج و عواقب کو جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، "بدیشی حکومت کے خاتمہ" کے دلفریب نقاب میں پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ اختلافِ مذاہب چونکہ "ہندو مسلم اتحاد" کے راستہ میں روڑا اٹکاتا ہے اس لئے مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کا معصوم سبق دیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کا یہ ایمان کہ اسلام تمام ادیانِ عالم پر فوقیت رکھتا ہے، چونکہ بچوں کے قلب و دماغ کو "تنگ نظری اور تعصب" کے زہر سے مسموم کر دیتا ہے اس لئے درسگاہوں میں ایک ایسے مذہب

---

[1] میرا ایک مضمون "متاعِ کارواں" کے عنوان سے رسالہ ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا۔ زیرِ نظر مضمون انہی خطوط پر مشتمل ہے اور اکثر اقتباسات بھی اسی سے لئے گئے ہیں۔ منہ

[2] مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۳۸ء۔ اور جو الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ منہ

کی تعلیم کی تجویز کی جارہی ہے جو اکبرؔ کے دین الٰہی یعنی دورِ حاضرہ کے برہمو سماج کے خطوط پر مشتمل ہے۔ اہنسا کے مسلک سے چونکہ سبعیت و بربریت کے خونخوار جذبات کی انگیخت ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی جگہ اہنسا کا فلسفۂ حیات جنتِ قلب و نظر بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور تعلیم کے ان تمام غیر اسلامی عناصر کو "روٹی" کے دلکش غلاف میں لپیٹ کر ایسا خوش آئند "مسنوس" بنا دیا گیا ہے کہ جو دیکھے لپک کر اُٹھا لے۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے اُردو کی جگہ ہندی زبان کی ترویج ہو رہی ہے اور اصل مقصد کو نگاہوں سے اوجھل رکھنے کے لئے کہا یہ جاتا ہے کہ متحدہ قومیت کے لئے ایک مشترکہ زبان کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

مسئلہ کی اہمیت

مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور انھیں اس غلط فہمی میں اور زیادہ مبتلا کیا جا رہا ہے کہ زبان کا مسئلہ محض ایک ادبی مسئلہ ہے کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے اسکا کیا تعلق؟ لیکن انھیں یہ معلوم نہیں کہ کسی قومیت کو بنانے اور بگاڑنے میں کسی تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کر دینے میں کسی قوم کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کر دینے میں۔ زبان کا ایک غیر معمولی اثر ہوا کرتا ہے جس قوم کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے وہ ایک مستقل قوم ہے۔ اور جس قوم کی زبان میں خود اپنا لٹریچر موجود ہے اور ترقی کر رہا ہے وہ ایک زندہ قوم ہے۔ جسوقت وہ قوم اپنی زبان چھوڑنے اور اپنا رسم الخط بدل دینے پر آمادہ ہو جائے اُس وقت سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنی قومیت کو بدل رہی ہے اپنی تہذیب سے رشتہ منقطع کر رہی ہے اپنی قبر اپنے ہاتھوں کھود رہی ہے۔ غیر محسوس طور پر تباہی اور بربادی کے عمیق غاروں کی طرف کھنچی جا رہی ہے۔

یہ ایک "تنگ نظر" مسلمان ہی کا خیال نہیں ہے بلکہ "کشادہ ظرف" ہندو بھی اس کے مؤید ہیں چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں۔

"ایک قوم کے لئے زبان کا مسئلہ ہمیشہ بڑا اہم رہا ہے۔ آج سے تین سو برس

پیشتر ملٹن نے فلورنس سے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اسکی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔ کسی قوم کے اپنی ایک زبان رکھنے کو خواہ وہ زبان بگڑی ہوئی ہو یا خالص ہو ایک غیر اہم سا واقعہ نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ اور نہ اس امر کو کہ اس کے افراد زبان کے برتنے میں صحت کا کہاں تک لحاظ رکھتے ہیں..... کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سلطنت یا مملکت اسوقت تک اوسط درجے کی خوشحالی و فلاح سے محروم کردی جاسکتی ہو جس وقت تک اس کے افراد اپنی زبان کو پسند کرتے اور اس کی طرف کافی توجہ کرتے رہے ہوں"

ایک دوسری جگہ پنڈت جی فرماتے ہیں۔

"رسم الخط اور ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جسکا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدلجاتی ہیں۔ آوازیں بدلجاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم و جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہوجاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہوچکی ہے" (میری کہانی جلد اول ص۲۹۵)

ان الفاظ کو ذرا غور سے پڑھیئے اور انھیں دل کی گہرائیوں میں جگہ دیجئے کیونکہ اس مضمون میں ان کی طرف بار بار توجہ کرنی پڑے گی۔

اُستادانِ ازلی"

ہم "واردھا اسکیم" والے مضمون میں بتاچکے ہیں کہ ہندوستان سے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن بلکہ مذہب کو مٹانے کے لئے ہندو کسطرح انگریز کے قدم بقدم چل رہا ہے۔

اِس لئے کہ بساطِ سیاست کی تمام چالیں ہندو نے انگریز ہی سے سیکھی ہیں۔ انگریزوں نے انگریزی زبان کو سرکاری زبان اور ذریعۂ تعلیم قرار دیکر جو کاری ضرب master stroke لگائی تھی اسکا نتیجہ آپ اپنے ماحول میں دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے غلاموں کی زبان دور نکلی، کو بحکم نہیں مٹایا اسے بدلنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسے زندہ رہنے کا حق اسی طرح دیا۔ جسطرح "مذہبی آزادی" کا حق عنایت کیا ہے بلکہ اسی طرح کراچی کے رزولیوشن میں "بنیادی حقوق" کے سلسلہ میں کانگریس کی طرف سے یہ حق دیا گیا ہے۔ انگریزوں نے صرف اتنا ہی کیا کہ ذریعۂ تعلیم کو بدل دیا۔ اور جدید زبان جاننے والوں کے لئے ترقی کے دروازے کھولدیئے۔ نوّے سال کی مدت کسی قوم کی زندگی میں کوئی مدت نہیں مگر آپ نے دیکھا کہ اس نوّے سال کے اندر اس پالیسی نے کیا نتائج پیدا کر دیئے۔ ہم انگریزی پر ٹوٹ پڑے۔ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات اپنی زبان سے اور اس کے ساتھ ہی اپنے ماضی سے۔ اپنی قومی روایات سے اپنے لٹریچر سے۔ اپنی تہذیب و تمدن سے اور اپنے خیالات سے بیگانہ ہو گئے۔ انگریزی زبان اور انگریزی قوم کے خیالات ہمارے دل و دماغ کی انتہائی گہرائیوں میں گھس گئے اور اس پالیسی نے ہمیں اندر سے بدل دیا (جسے قرآن کریم "تغیّرِ نفس" کہتا ہے کہ جس کے بدلنے سے ساری قوم بدل جاتی ہے) گویا وہ مقصد حاصل ہو گیا جسکے پیش نظر میکالے اور اسکے رفقاء کار نے یہ شاہ ضرب تجویز کی تھی یعنی "اس زبان کے ذریعہ سے ایک ایسی قوم پیدا ہو گی جو رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی مگر روح کے اعتبار سے انگریز ہو گی"۔ ذرا اپنے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ کی ساخت کو ملاحظہ فرمایئے وہ کسقدر مغربی قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ انگریزوں نے مذہبی آزادی کو برقرار رکھا۔ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن میں مداخلت نہیں کی لیکن ایک زبان کے بدل دینے سے قوم کی قوم کو اپنے مذہب اور تمدن سے اسقدر بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر بنا دیا کہ عیسائی مشنریز یا دری ہزار برس بھی مسیح کی منادی کرتے

رہتے تو یہ نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ ہماری حالت آج یہ ہے کہ آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے کسی اور کی نگاہ سے ہیں۔ کان اپنے ہیں لیکن سُنتے کسی اور کی قوت سماعت سے ہیں۔ دل اپنے ہیں لیکن سمجھتے کسی اور کے ذریعہ ادراک سے ہیں۔ ہم بالکل "ہز ماسٹرز وائس" بن گئے ہیں۔ ایک انگریز مسلمان ہو کر بھی "انگریز" ہی رہتا ہے۔ لیکن ایک تعلیم یافتہ مسلمان مسلمان کہلاتے ہوئے بھی "مسلمان" نہیں ہوتا۔ یہ قلبِ نظر کی تبدیلی کس چیز نے پیدا کر دی؟ یہ ذہنیت کس نے بدل دی؟ صرف ایک زبان کی تبدیلی نے۔ اور وہ تبدیلی بھی جبری تبدیلی نہیں۔ آپ کی زبان کو مٹا کر نہیں۔ بہنسی خوشی۔ آپ کی پوری آزادی برقرار رکھتے ہوئے مدرسوں میں عربی۔ فارسی۔ اُردو کی تعلیم کی باقاعدہ اجازت دیتے ہوئے تعلیم کو اختیاری رکھتے ہوئے (یعنی جسکا جی چاہے بچے کو پڑھائے نہ جی چاہے نہ پڑھائے) آپ کے رسم الخط کو برقرار رکھتے ہوئے! سمجھے آپ کہ زبان کا مسئلہ کسقدر اہم ہے۔ فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الْاَبْصَار

شاگردانِ رشید

ہندوستانی قومیت کے معمار بھی انھیں کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے اپنی قومیت کو بنانے اور دوسروں کی قومیت کو بگاڑنے کی تدابیر بھی انھیں سے سیکھی ہیں۔ انگریز چونکہ غیر ملکی تھا اس لئے اس کے نظر فریب مصالح مشتبہ نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے لیکن یہ چونکہ اسی ملک کے لوگ ہیں اس لئے انکے لیئے وہ انقلاب پیدا کر دینا آسان ہے جس کی جرأت ان کے اُستاد نہیں کر سکتے تھے کیونکہ انکے پاس "وطن کی مشترکہ فلاح و بہبود" کا دعویٰ ایک ایسا کارگر حربہ ہے جسکے ذریعہ وہ مسلمانوں کو مکمل فریب دے سکتے ہیں (اور دے رہے ہیں) اور کوئی انکو ٹوکنے کی جرأت نہیں کر سکتا تاوقتیکہ اس میں "ٹوڈی۔ رجعت پسند۔ سامراج پرست" کے گھناؤنے القاب سننے کی ہمت نہ ہو۔ انگریز یہاں "متحدہ قومیت" کا تصوّر پیش نہیں کر سکتے تھے اس لئے کہ ایسا کرنے سے انکی اقلیت یہاں کی اکثریت میں

گم ہوجاتی لہذا انھوں نے حاکم و محکوم کے فرق کو محفوظ رکھا لیکن اسکا تلخ نتیجہ آج انکے سامنے ہے۔ ہندو اس تجربہ سے فائدہ اوٹھانا چاہتا ہے اور بجائے اسکے کہ اپنی اکثریت کو الگ حاکم قوم کی شکل میں متمیز کر کے اقلیتوں کے دل میں محکومیت کے نفرت انگیز احساس کو زندہ رکھے جبالآخر حاکم قوم کے خلاف انقلابی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ وہ اپنی حکومت کے استحکام کے لیئے یہ بات زیادہ مصلحت آمیز سمجھتا ہے کہ ایک متحدہ قومیت کے جاذبِ نظر تصور کو پیش کر کے اقلیتوں کو اکثریت کی زنبیل میں لپیٹ لے اور انکا رنگ یوں قائم نہ رہنے دے اقلیتیں یہ سمجھ کر خوشی خوشی اکثریت کے اندر جذب ہوجائیں کہ ہم جمہوری حکومت کی مشینری کا ایک جزو لاینفک بن رہی ہیں گو کہ حقیقت یہ ہو کہ وہ مشینری ان کو اس انداز سے بیکار رکھدے کہ آئندہ انکی طرف سے کوئی خطرہ ہی باقی نہ رہے۔ یعنی یہ اپنا الگ قومی تشخص کھو کر اکثریت کے اندر ہی جذب ہوجائیں۔ تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری مخلوط انتخاب۔ مخلوط پرچم۔ مخلوط نام۔ مخلوط تعلیم۔ اور اس کے بعد مخلوط زبان اسی مخلوط قومیت کی طرف لے جانے والے راستے ہیں جن سے مقصدِ وحید یہ ہے کہ مسلمانوں کی اہم اقلیت جو ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کی حالت میں اکثریت کی حکومت کے لیئے خارِ چشم کا حکم رکھتی ہے۔ اکثریت کے اندر جذب ہوجائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیئے مسلمانوں کی زبان کا مٹانا نہایت ضروری ہے۔ اور اسی کے لیئے آج ہندو پوری سرگرمی سے مصروفِ جد و جہد ہے۔ چنانچہ جیسا کہ ہم "واردھا اسکیم" والے مضمون میں لکھ چکے ہیں۔ آزادیٔ ہند کے سب سے بڑے علمبردار مہاتما گاندھی نے "سیاست" سے الگ ہو کر خالص "اصلاحی" تحریکوں کو اپنا نصب العین زندگی بنا رکھا ہے۔ ان میں اچھوتوں کی اصلاح اور ہندی کی ترویج اہم تحریکیں ہیں۔ خدانخواستہ انکا مقصد یہ نہیں کہ اردو زبان اور اسکے رسم الخط کو مٹا ڈالیں۔ انکا مقصد تو صرف ہندی زبان ہے۔ اور کسقدر پاک مقصد ہے کہ ہندی زبان کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ

ہندوستان کی "قومی زبان" بنا دیں۔ اگر اسکا نتیجہ عملاً وہی نکلتا ہو جو اُردو زبان کے مٹانے کا ہو سکتا ہے یا اس سے اُردو زبان "خود بخود" مٹ جائے تو اس میں مہاتما جی کا کیا قصور؟ اس لیے کہ کانگریس کے شعبۂ اسلامیات کے انچارج ڈاکٹر اشرف صاحب ہمکو ایک سرکاری کمیونک میں یقین دلا رہے ہیں کہ گاندھی جی کو ایسا کرنیکا پورا پورا حق حاصل ہے اور انکا یہ فعل "فرقہ پرستی" نہیں۔ ہاں اس کے مقابلہ میں کچھ کہنا ضرور "فرقہ پرستی" ہے

گاندھی جی کا خیال یہ ہے کہ ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور وہ دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہیئے (ہریجن بحوالہ ٹریبون مورخہ ۸ جولائی ۱۹۳۸ء) مگر یہ بات وہ ہندو "فرقہ پرست" ہونے کی حیثیت سے نہیں کہتے بلکہ انکا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو، مسلمان اور دوسری قوموں کو ملا کر جو قوم بنانا پیش نظر ہے اسکی زبان ہندی ہو اور رسم الخط ہندوستانی۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے وہ طریق کار اختیار کیا ہے جو ایک ٹھیٹھ "قوم پرست" کو اختیار کرنا چاہیئے۔ وہ جب کانگریس میں تشریف لاتے ہیں تو ہندوستان کی مشترک "قومی زبان" کا نام "ہندوستانی" رکھتے ہیں مگر جب ہندی سمیلن میں تشریف لیجاتے ہیں تو اسی قومی زبان کا نام "ہندی" ہو جاتا ہے۔

مدراس میں ہندی سمیلن کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں گاندھی جی نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا

> "صرف ہندی زبان ہے جسکا بعد میں جا کر دوسرا نام ہندوستانی اور اُردو بھی پڑ گیا، اور جو دیوناگری اور اُردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اسکی صلاحیت تھی اور ہے کہ وہ ہمارے ملک کی مشترک زبان قرار دیجائے" (ملاحظہ ہو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے شعبۂ اطلاعات سیاسی و معیشتی کا کمیونک)

اسی رجحان کے تحت ہندی ہندوستانی" کی اصطلاح وضع کی گئی اور پھر اسکا نام ہندی اتھوا ہندوستانی" (ہندی یعنی ہندوستانی) ہو گیا۔

ایک دوسرے موقع پر بھارتیہ ساہتیہ پرشد (وفاق ادبیات ہند) کے اجلاس منعقدہ

مہاتما گاندھی جی نے جو تقریر فرمائی اسکے حسب ذیل فقرے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے شعبۂ اطلاعات سیاسی و معاشی کے سرکاری بیان سے نقل کیے جاتے ہیں جن سے آپکو اندازہ ہوگا کہ "فرقہ پرستی" کے برخلاف "قوم پرستی" کسطرح کام کرتی ہے

"میں نے آج نہیں بلکہ ۱۹۱۸ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر کی حیثیت سے ہندی بولنے والی دنیا کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ ہم لوگ ہندی کے مفہوم کو اتنا وسیع کر دیں کہ اسکی تعریف میں اُردو آجائے جب ۱۹۳۵ء میں میں نے دوسری بار سمیلن کی صدارت کی تو میں نے "ہندی" اصطلاح کی باضابطہ طور پر اسطرح تعریف کی کہ ہندی اس زبان کا نام ہے جسے ہندو اور مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اس توضیح سے میرا منشا یہ تھا کہ ہندی زبان بیک وقت مولانا شبلی کی فصیح و بلیغ اُردو اور پنڈت شیام سندر داس کی فصیح و بلیغ ہندی پر مشتمل ہو۔ اسکے بعد بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا زمانہ آیا جو ہندی سمیلن کی ضمنی تحریک ہے۔ اسکے اجلاس میں میری سفارش پر ہندی کے بجائے ہندی ہندستانی کی اصطلاح اختیار کی گئی۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس اجلاس میں میری تجویز کی مخالفت کی مگر میں انکی تجویز نہ ماننے کے لیے مجبور تھا۔ اگر مولوی صاحب کی تجویز کے مطابق میں ہندی کے لفظ کو نکال دیتا تو یہ میرے اور سمیلن کے اوپر ظلم تھا اس لیے کہ یہ لفظ ہندی سمیلن والوں کا دیا ہوا تھا اور وہ میری سفارش پر ہندی کی تعریف میں اُردو کو داخل کر چکے تھے۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھیے کہ "ہندی" لفظ کچھ ہندوؤں کی اختراع نہیں ہے یہ نام مسلمانوں کی آمد کے بعد پڑا ہے اور اس سے مراد وہ زبان ہے جو اسوقت شمالی ہند کے ہندو مسلمان بولتے اور لکھتے پڑھتے تھے۔ لاتعداد مشہور و معروف مسلمان مصنفوں نے اپنی مادری زبان کو ہندی نام سے یاد کیا ہے۔ پھر اب جبکہ ہندی زبان کی حد بندی میں ہندو اور مسلمان دونوں کی ہر قسم کی تحریری اور تقریری زبان شامل ہے تو لفظوں کے اختلاف پر یہ ہنگامہ اور غوغا کیوں ہے؟"

اس بحث کا ایک پہلو اور بھی سوچنے کے قابل ہے۔ جہانتک جنوبی ہند کی زبانوں کا تعلق ہے وہ صرف ایسی ہندی سے الگ رکھا سکتی ہیں جنمیں سنسکرت کے الفاظ کی ملاوٹ ہو اس لیے کہ

یہ زبانیں سنسکرت کے بعض الفاظ اور سنسکرت آوازوں سے مانوس ہیں۔"

اب آپ کے سامنے ہندوستان کی "قومی زبان" کے ارتقاء کا وہ پورا نقشہ آجاتا ہے جو قومیت ہند کے اس معمارِ اعظم کے پیشِ نظر ہے۔ اس نقشہ کے مطابق پہلا مرحلہ یہ ہے کہ "ہندی" کے دامن کو پھیلا کر "اردو" کو اس میں سمیٹ لیا جائے۔ اردو کے علیحدہ نام سے جو امتیاز ان دونوں زبانوں میں پیدا ہوتا ہے وہ محض ذرا سے تبدیل نام کے ساتھ مٹا دیا جائے اور ان دونوں کو ملا کر ایک نام "ہندی" سے موسوم کیا جائے تاکہ یہ تخیل زندہ نہ رہ سکے کہ یہ دو الگ زبانیں ہیں۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ جنوبی ہند کی زبانوں سے تعلق پیدا کرنے کی خاطر اردو کو آہستہ آہستہ ہندی کے قریب لایا جائے۔ اس میں ہندی اسالیب بیان، سنسکرت کے الفاظ اور سنسکرت آوازیں پیدا کی جائیں اور اس طرح "ہندی" کا دامن اردو کو سمیٹ لئے ہوئے سکڑنا شروع ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے اسالیب بیان اور اپنے ذخیرۂ الفاظ اور آوازوں کی حد تک کوئی علیحدہ زبان نہ رہے۔ بلکہ ہندی کے وجود میں تحلیل ہو کر رہ جائے۔

تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جب اردو اس طور پر ہندی میں تحلیل ہو جائے تو رفتہ رفتہ رسم الخط کے امتیاز کو بھی دور کر دیا جائے۔ سردست رسم الخط کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔ کراچی ریزولیوشن کے کھا دینے سے اردو والے دل پہلائے رہیں جب قوم پرستی بڑھے گی اور اس کے اثر سے زبان کے الفاظ اور آوازوں میں تغیر پیدا ہوگا تو آہستہ آہستہ رسم الخط خود بدل جائیگا۔ ان تینوں مرحلوں کو اگر آپ ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھیے کہ پہلے عبداللہ کا نام پرمیشری داس لکھ دیا جائے۔ جب وہ اس پر کان کھڑے کرے تو اس سے کہا جائے کہ میاں محض لفظوں کے اختلاف پر ہنگامہ اور غوغا کیوں بپا کرتے ہو۔ پرمیشری داس کے معنی بھی تو وہی ہیں جو عبداللہ کے ہیں۔ صرف الفاظ ہی تو بدلتے ہیں معنی میں تو کوئی فرق نہیں آتا۔ جب وہ اس طرح سمجھانے پر مان جائے تو پھر اسے یہ سمجھایا جائے کہ بھائی پرمیشری داس ذرا کبھی کبھی دھوتی باندھ لیا کرو، اپنا ہی بھوجن جو تم کھاتے ہو، آپ رکھ کر کھانے لگو ہمیں کوئی حرج تو ہے نہیں اور فائدہ یہ ہے کہ یہ کروڑوں کی آبادی جس کے ساتھ تمہارا رہنا سہنا اور مرنا جینا ہے اس سے تمہاری اجنبیت دور ہو جائیگی۔ جب پرمیشری داس بھی اس معقول تجویز کو بھی مان لیں تو انکو یاد دلا کر چھوڑو۔ آہستہ آہستہ آپ ہی راستہ پر پڑھنے دو۔ اگر وہ نہیں تو انکے صاحبزادے (جو شاید پہلے قمرالدین ہوتے) یا انکے پوتے رام پیارے (جو حبیب اللہ ہوتے) اگر یہ چال چلی جاتی خود بخود شدھ پیدا ہونگے بغیر اسکے کہ اسکی شدھی کے لئے شنکر اچاریہ آف شاردا پیٹھ کی مدد حاصل کیجائے۔ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا کرنیکی اس سے بہتر تدبیر اور کیا ہو سکتی ہے؟

ہندی زبان

مہاتما گاندھی نے اپنے دعوے کے اثبات میں اس واقعہ سے بھی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ قدیم زمانہ میں خود مسلمان بھی اُردو کو ہندی کے نام سے تعبیر کیا کرتے تھے اس لئے اگر اب ہندوستان کے مشترکہ زبان کا نام "ہندی" رکھدیا جائے تو یہ گویا اصل کی طرف رجوع کرنا ہوگا یہ دلیل بظاہر کسقدر خوش آئند و محکم ہے اور کتنی انصاف پر مبنی ہے، لیکن جن حضرات کی نگاہ تاریخ کے اوراق پر ہے۔ انہیں یہ معلوم کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوگی کہ مہاتما جی نے حقیقت کو کتنے باریک "چلمنی پردہ" میں چھپانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ مسلمان، قواعد زبان کی رو سے ہند کی ہر چیز کو یائے نسبتی کے ساتھ ہندی کہتے تھے، (جیسے عرب سے عربی۔ فارس سے فارسی۔ اسی طرح ہند سے ہندی) اس وقت یہاں کی مروجہ زبان کے مقابلہ میں کوئی اور زبان ایسی تھی ہی نہیں، جسے اصطلاحاً ایک الگ نام رکھانے کی ضرورت محسوس ہوتی، وہ زبان جسے آجکل کی اصطلاح میں "ہندی" کہتے ہیں بعد کی پیداوار ہے۔ اور خالص ہندوانہ ذہنیت کی پیداوار۔ ارباب علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اٹھارویں صدی کے آخیر تک اُردو کے مقابلہ میں کسی اصطلاحی "ہندی" زبان کا چرچا نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۳ء میں للوجی نے، پریم ساگر نامی کتاب لکھی۔ یہ ناگری رسم الخط میں تھی اور اس میں اُردو اس قسم کی استعمال کی گئی تھی، جس سے فارسی کے عناصر فی الجملہ خارج کر دیئے گئے تھے، اور اُن کی جگہ سنسکرت کے الفاظ زیادہ استعمال کئے گئے تھے، یہ تھی ہندی کی کتاب۔ یعنی اُردو کے مقابلہ میں ایک نئی زبان جسے اصطلاح میں ہندی کہا گیا۔ چونکہ اس زبان کا رسم الخط فارسی رسم الخط (یعنی مسلمانوں کے رسم الخط) سے مختلف تھا، اور سنسکرت کے رسم الخط (یعنی ہندوؤں کی قدیم زبان کے رسم الخط) کے مطابق۔ نیز اس میں عربی فارسی الفاظ کے بجائے سنسکرت کے الفاظ کے استعمال کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ اس لئے ہندوؤں نے اسے اپنی زبان قرار دے لیا اور اس کی نشر و اشاعت میں دلچسپی لینے لگے، مسلمانوں کے نزدیک یہ بات کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ اس لئے انہوں نے۔

اس تحریک کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ لیکن ہندو تو بساط سیاست کے بڑے گہرے شاطر واقع ہوئے ہیں، مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ یہ تحریک بھی بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ ۱۸۶۹ء میں اس نے ایک خاص منظم صورت اختیار کرلی جبکہ ۶ دسمبر کو بابو سردو پرشاد نے یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ الہ آباد انسٹی ٹیوٹ کی روئداد اردو کے بجائے ہندی میں لکھی جائے اسوقت کچھ ارباب بصیرت مسلمانوں نے اس خطرہ کو محسوس کیا۔ اور سر سید۔ سید وارث علی۔ خان بہادر میر سید محمد۔ فدا حسین اور منصور احمد وغیرہ حضرات نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ۔ جلوۂ طور میرٹھ۔ اور اودھ اخبار لکھنؤ میں اس کے خلاف مضامین لکھے۔ مسلمانوں کا چونکہ دور انحطاط تھا اس لئے اُن کی مساعی قلم و قرطاس کی حد سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ بلکہ اس کے بعد تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔ لیکن ہندو اپنی دوسری تحریکوں کی طرح اس تحریک کو بھی منظم طریق پر آگے بڑھاتے رہے۔ اور پوری استقامت کے ساتھ اسے جاری رکھا۔ حتیٰ کہ اب وہ اسے ایک قومی تحریک کا خوشنما لباس پہنا کر میدان عمل میں لے آئے ہیں، ہندوان تمام تحریکوں کو کم و بیش نصف صدی سے آتش خاموش کیطرح اندر ہی اندر سلگاتے چلے آرہے ہیں، اور مسلمانوں کو اسوقت ہوش آیا ہے۔ جبکہ وہ پوری حدت اور تمازت کے ساتھ شعلہ بار ہو چکی ہیں، پھر چونکہ ہندوان تمام تحریکوں کو منظم طریق پر چلا رہے ہیں نہ کہ ہنگامی انداز سے اس لئے انہوں نے ایک "مشترکہ مقصد" یعنی "حصول آزادی کے لئے متحدہ قومیت کی تشکیل" کی کشش کے ماتحت کچھ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ اور اس طرح سے ان خالص ہندوانہ تحریکوں کو "قومی" تحریکوں کا لیبل لگا کر میدان سیاست میں لئے آرہے ہیں، ۱۸۶۹ء میں چونکہ ایک طرف سر سید اور منصور احمد وغیرہ مسلمان تھے، اور دوسری طرف بابو شیو پرشاد اور نوبن چندر رائے وغیرہ ہندو۔ اس لئے ہندوؤں کی تحریک ترویج ہندی خالص ہندوانہ تحریک تھی۔ لیکن آج چونکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو کے ساتھ ڈاکٹر اشرف اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی ہیں، اس لئے آج وہی تحریک قومی تحریک بن گئی ہے۔

اور اس کی مخالفت کرنے والے خود مسلم قومیت پرست حضرات کے نزدیک۔ انتہائی نفرت انگیز انقلاب کے مستحق۔ یہ ہیں بساطِ سیاست کی گہری چالیں!!

ہندو ذہنیت کا مظاہرہ

جب یہ تحریک اس زور اور قوت کے ساتھ پھیلائی جانے لگی تو مسلمانوں کی وہ جماعت جس کی دیدہ ور نگاہیں "متحدہ قومیت" اور "مشترکہ زبان" کے فریب کو بے نقاب دیکھ چکی تھیں، اس نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور مسلمانوں کو آگاہ کرنا چاہا کہ یہ محض ایک ادبی اور مجلسی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ اُن کی ملّی اور جماعتی موت و حیات کا رشتہ بندھا ہوا ہے۔ تو کانگریس کا ہندوانہ سیلاب بلا چاروں طرف سے اُبھر امنڈ آیا۔ مضمون کے شروع میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اسے خود تسلیم کیا ہے کہ ایک قوم کی تہذیب دشمن کو مٹانے کے لئے یا برقرار رکھنے کے لئے زبان کا مسئلہ کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن جب اس اہمیت کا احساس کرتے ہوئے مسلمانوں نے ہندوؤں کے اس طرزِ عمل کے خلاف آواز اُٹھائی اور اپنی زبان کے تحفظ کا مطالبہ کیا تو انہی پنڈت جی نے فتویٰ صادر فرما دیا کہ "فارسی اور دیوناگری کے جھگڑے احمقانہ ہیں"۔ (میری کہانی جلد دوم صفحہ ۳)

اللہ اکبر! وہی رسم الخط جس کے بدل جانے سے خود پنڈت جی کے الفاظ میں یہ اندیشہ ہے کہ الفاظ کی شکلیں بدل جائیں گی۔ آوازیں بدل جائیں گی خیالات بدل جائیں گے۔ قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار حائل ہو جائے گی، اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جائیگا جو مردہ ہو چکی ہے؟ جب اس کے تحفظ کے لئے مسلمان آواز بلند کریں تو یہ جھگڑا احمقانہ بن جاتا ہے! یہ کیوں ہے؟ اس کی وجہ خود پنڈت جی بیان فرماتے ہیں کہ "ہندوستان میں ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ایک متحدہ قوم پیدا ہو"

(جامعہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

اس لئے اگر مسلمان اپنی زبان کی امتیازی حیثیت برقرار رکھنا چاہیں تو وہ "فرقہ پرست" ہیں:-

"مگر بدقسمتی سے ابھی تک ہندوستان میں فرقہ پرستی طاقتور رہی ہے، اور اس بنا پر زبان میں "علیحدگی پسندی" کا رجحان بھی وحدت کے رجحان کے ساتھ ساتھ برابر اپنا اثر دکھاتا جا رہا ہے۔ قوم پرستی کے پورے نشوونما کے ساتھ یہ علیحدگی پسندی جو زبان کے معاملہ میں پائی جاتی ہے یقیناً فنا ہو جائے گی۔ ...... ایک علیحدگی پسند، حامی زبان کو اوپر سے کھرچو تم دیکھو گے کہ اندر سے وہ فرقہ پرست ہے۔ بلکہ زیادہ تر تم کو ایک سیاسی رجعت پسند پاؤ گے" (یہ پنڈت جی کا ایک مضمون ہے جو ہندوستان کے اکثر اردو اور انگریزی اخبارات میں شائع ہو چکا ہے)۔

اِن تصریحات سے آپ پنڈت جی کا مافی الضمیر اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، زبان اور رسم الخط کے مسئلہ کو ایک قابلِ نفرت "فرقہ وارانہ مسئلہ" قرار دینا اور "سیاسی رجعت پسندی" سے موسوم کر کے اسکو اور زیادہ ذلیل بنانے کی کوشش کرنا کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ پنڈت جی زبان اور رسم الخط کی اہمیت سے ناواقف ہیں، نہیں بلکہ معاملہ بالکل برعکس ہے، وہ اس کی اہمیت سے خوب واقف ہیں، اور اسی واقفیت کی بنا پر وہ اس کے خلاف اپنی مخصوص سیاسی زبان کے شدید ترین الفاظ ـــــ "فرقہ پرستی"، "رجعت پسندی"، "سامراج پرستی" وغیرہ ـــــ پورے زور کے ساتھ استعمال کرتے ہیں تاکہ اس گولہ باری سے یہ قلعہ کسی طرح منہدم ہو جائے۔ ان کو خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کے پاس اپنی ایک مخصوص قومی زبان کا محفوظ رہنا در اصل ان کی مخصوص قومیت کے محفوظ رہنے کا ہم معنی ہے، جب تک یہ زبان ایک علیحدہ رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اور اس میں وہ الفاظ اور اسالیب بیان موجود ہیں، جو اسلامی ذہنیت کی ترجمانی کرتے ہیں، اس وقت تک مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور ان کی مستقل قومی تہذیب فنا نہیں ہو سکتی اور نہ اس لٹریچر سے بیگانہ ہو سکتے ہیں، جو ان کے ذہن میں اس قومیت اور اس تہذیب کی قدر و قیمت پیدا کرتا ہے، اس حقیقت سے بے خبری نہیں بلکہ کامل باخبری ہی ان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ زبان میں "علیحدگی پسندی" کے رجحان کو "فرقہ پرستی" جیسے گھناؤنے

العتاب سے یاد کر کے آزادی پسند مسلمانوں میں اس کے خلاف نفرت پیدا کریں، اس لئے کہ دراصل ان کا نصب العین ہندوستان کی تمام آبادی کو "ایک قوم" بنانا اور جُدا جُدا قومیتوں کو فنا کر دینا ہے، اُن کے نزدیک "سیاسی رجعت پسندی" یہ ہے کہ اس ملک کی کوئی قوم اپنی مستقل قومیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور "سیاسی ترقی پسندی" یہ ہے کہ سب قوموں کے لوگ اپنی اپنی قومیتوں کو چھوڑ کر اس "ایک قوم" میں جذب ہو جائیں جسے پنڈت جی وجود میں لانا چاہتے ہیں اس قسم کی متحدہ قومیت پیدا کرنے کے لئے منجملہ دوسری تدابیر کے ایک یہ تدبیر بھی ضروری ہے کہ ایک "مشترک قومی زبان" پیدا کی جائے، اور ہر ایسی زبان کو مٹا دینے یا کم از کم مسخ کر دینے کی کوشش کیجائے، جو کسی قوم کی جُداگانہ قومیت کو سہارا دیتی ہے یہی نصب العین ہے جس کو پیش نظر رکھ کر "ہندوستانی" زبان کا پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے آخر منزل مقصود پنڈت جی کے نزدیک بھی یہی ہے کہ زبان اور رسم الخط دونوں میں "علیحدگی پسندی" کے رجحان کو مٹا دیا جائے۔ لیکن وہ اپنے ہم مشربوں سے زیادہ ہوشیار ہیں اس لئے کہتے ہیں کہ تدریج کے ساتھ ایک ایک قدم بڑھاؤ، دفعتاً رسم الخط پر ہاتھ ڈالو گے تو شکار ہاتھ سے نکل جائیگا لہٰذا سردست اس کی حفاظت کا اطمینان دلاؤ۔ اور پہلے الفاظ و اسالیب بیان میں "علیحدگی پسندی" کا رجحان دُور کرنے کی کوشش کرو جب اُردو زبان عربی و فارسی الفاظ کے ذخیروں سے خالی ہو کر ہندی الفاظ سے بھرپور ہو جائے۔ جب ذخیرۂ الفاظ کے بدلنے سے اسالیب بیان اور خود حقیقت بیان میں تغیر پیدا ہو جائے تو سمجھ لو کہ آدھا معرکہ سر ہو گیا۔ اسکے بعد دیکھیں گے مستقبل نے اگر کوئی مناسب موقع فراہم کر دیا تو رسم الخط میں بھی "علیحدگی پسندی" کا رجحان مٹا دیا جائے گا اور "مشترک قومی زبان" کی تخلیق پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ دانشمندانہ پالیسی اور کیا ہو سکتی ہے اسی بنا پر پنڈت جی فرماتے ہیں:۔

"اِس لئے دانشمندی کے ساتھ ہم نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ دونوں رسم الخطوں کو پوری آزادی حاصل رہے اگرچہ یہ اُن لوگوں پر ایک مزید بار ہو گا جنہیں دونوں

کو سیکھنا پڑیگا؛ وقتاً ایک حد تک علیحدگی پسندگی کے لیے بھی مددگار ہوگا مگر ہمیں اپنی نقصانات کے ساتھ کام کرنا پڑے گا، کیونکہ ہمارے لیے کوئی دوسرا راستہ کھلا ہوا نہیں ہے ..... مستقبل ہمارے لیے کیا کچھ لائے گا، اس کی مجھے خبر نہیں، مگر سردست دونوں کو باقی رہنا چاہیئے" (پنڈت جی کا مذکورۂ بالا مضمون)

.مَیں اس امر میں کوئی شک شبہ نہیں رکھتا کہ ہندی اور اُردو دونوں ایک دوسرے کے قریب آکر رہیں گی۔ خواہ یہ دونوں مختلف لباس پہنے رہیں، مگر اپنے جوہر اور روح کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہوں گی، جو قوتیں اس وحدت کی تائید کر رہی ہیں وہ اسقدر طاقتور ہیں کہ افراد اُن کی مزاحمت نہیں کرسکتے، یہاں قوم پرستی ہے اور ایک متحد ہندوستان دیکھنے کی خواہش عام طور پر پھیلی ہوئی ہے اسی کی فتح ہو کر رہے گی ..... اگرچہ ہم خوشی کے ساتھ اس علیحدگی کو برداشت کرینگے جو اسوقت قائم ہے مگر ہم کو وحدت قایم کرنیوالوں کی اس عمل میں مدد دینی چاہیئے" (مضمون مذکور)

یہاں آکر پنڈت جواہرلال نہرو اور مہاتما گاندھی کے راستے ملجاتے ہیں. اگرچہ پنڈت جی علیحدگی کے رجحان کو سخت قابلِ نفرت سمجھتے ہیں اور مہاتما جی کے طرزِ عمل میں علیحدگی پسندی کا یہ رجحان بالکل نمایاں ہے، اس بنا پر پنڈت جی کو مہاتما جی سے نہ صرف اختلاف کرنا چاہیئے تھا، بلکہ انہیں "فرقہ پرست" اور سیاسی "رجعت پسند" کہنا چاہیئے. مگر چونکہ مقصد دونوں کا ایک ہے اور دونوں ایک ہی منزلِ مقصود کیطرف دو علیحدہ راستوں سے چلکر ایک مقام پر ملجاتے ہیں اس لیے دونوں میں کوئی بھی ایک دوسرے کو کھرچنے کی ضرورت نہیں سمجھتا، بلکہ پنڈت جی مہاتما جی کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:.

"کم سمجھ لوگ خود گاندھی جی کو اُس چیز کا مجرم ٹھیراتے ہیں جسکے خلاف اُنھوں نے اپنا پورا زور لگا دیا ہے" (جامعہ مورخہ اکتوبر ۳۶ء ص ۹۰۳)

کھلی ہوئی "فرقہ پرستی" کے مقابلہ میں "قوم پرستی" زیادہ کامیاب چیز ہے، آپ علانیہ ہندوں

کیلئے جال پھیلائیں گے تو چند بے وقوف پرندوں کے سوا کوئی اس میں نہ پھنسے گا۔ دام ہمرنگ زمین ہونا چاہیئے، دانہ بکھرا ہوا ہونا چاہیئے، اور ایک ہوشیار شکاری جو پرندوں کی ذہنیت سے خوب واقف ہو، آپ کی مدد پر ہونا چاہیئے، تاکہ وہ ہر طرف سے گھیر گھیر کر پرندوں کو دام کے پاس لائے۔ پھر دیکھئے کہ پرندوں کے رب النوع تک جال میں پھنسے ہوئے نظر آئیں گے، ہندوستان کی مشترک فلاح وبہبود کا نام لے کر "قومیت" کا جال بچھایئے اس پر سیاسی ترقی اور معاشی خوشحالی کا دانہ پھیلایئے اور ایک نقیب چھوڑ دیجئے جو اطراف ونواح میں اعلان کرتا پھرے کہ جو پرند اس جال کیطرف نہ آئے گا وہ فرقہ پرست اور سیاسی رجعت پسند قرار دیا جائے گا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا جائیگا کہ ہمارے سامنے اسوقت سب سے بڑا سوال ہندوستان کے افلاس اور بے روزگاری کا ہے اور جو دانہ بکھرا ہوا ہے (نیچے بچھے ہوئے جال کا ذکر نہ کیجئے) اسی سوال کو حل کرنے کے لئے بکھیرا گیا ہے اسکے بعد آپ دیکھیں گے کہ جھنڈ کے جھنڈ آپ کی طرف آئیں گے اور اسی طرح آپ کے جال پر گریں گے جیسے شمع پر دانے گرتے ہیں۔

اثرات

ترویج ہندی کی تحریک کو "قومی تحریک" کی شکل اختیار کئے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن اسکے نتائج واثرات اس قدر واضح اور بیّن طور پر سامنے آچکے ہیں کہ اگر ہندو نوازی کی پٹی کو آنکھوں سے اُتار کر دیکھا جائے تو ممکن نہیں کہ کوئی مسلمان اس خطرے سے انکار کر سکے جو مستقبل قریب میں اس راستہ سے اُن کی تہذیب وتمدن کو مٹانے کے لئے ایک سرکش وبیباک طوفان کی طرح بڑھتا چلا آرہا ہے۔ قبل اسکے کہ ہم اس کی چند مثالیں بیان کریں یہ دیکھ لینا چاہیے، کہ کانگریس کا (جو ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی نمائندگی کی مُدعی ہے) اس باب میں لفظی دعوے کیا ہے، تاکہ اسکے بعد اچھی طرح سے معلوم ہوسکے کہ دعوے کیا ہے اور عمل کیا ہے، یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے، کہ مسلمانوں کو جب کبھی ہندوؤں کے کسی طرزِ عمل کے خلاف شکایت پیدا ہوتی ہے تو ہندوؤں کی مدافعت

اور برہیت میں حضرت مولانا آزاد جھوٹ گواہوں کے کٹھرے میں تشریف لے آتے ہیں، اور مسلمانوں کو موردِ الزام اور ہندوؤں کو حق بجانب قرار دینے میں پوری قوت صرف کر دیتے ہیں، زبان کے مسئلہ میں بھی جب مسٹر جناح نے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے ہندوؤں کی روش کو مفادِ اسلامی کے خلاف ثابت کیا تو حضرت مولانا کیطرف سے ایک طول طویل بیان اخبارات میں شائع ہو گیا جسکے دوران میں وہ فرماتے ہیں:۔

"میں مسٹر جناح کو یقین دلاتا ہوں کہ انھوں نے اس مسئلہ کے متعلق جو کچھ سُنا ہے وہ بالکل غلط ہے اگر وہ حقیقتِ حال معلوم کرنے کی ذرا سی کوشش بھی کریں گے تو ان کو اپنے الزامات پر افسوس ہوگا، کانگرس کی قرارداد اور نہ صرف قرارداد، بلکہ اس کا عمل بھی ذمہ دار مسلمان جماعتوں اور حامیانِ اُردو کے مطالبات کے بالکل مطابق ہے اور فی الحقیقت وہی مسئلے کا ایک ہی صحیح حل ہے یعنی وہ صاف و سلیس اردو جو شمالی ہندوستان کے شہروں میں بولی جاتی ہے، قومی اور ملک کی باہمی صوبائی زبان کے طور پر تسلیم کیجائے اور دیوناگری اور اُردو دونوں رسم الخط تحریر کتابت کے لیے استعمال کیے جائیں۔

یہ زبان ایک اور یکساں ہے اور دونوں رسم الخط میں لکھی جا سکتی ہے اور ہر شخص جس رسم الخط کو چاہے اختیار کر سکتا ہے حکومت دونوں رسم الخط کے لیے آسانیاں مہیا کریگی اُسنے سادہ اُردو کے لیے "ہندوستانی" کا لفظ تجویز کیا ہے۔ تاکہ دونوں رسم الخط پر حاوی ہو جائے

مسٹر جناح کہتے ہیں کہ کانگرس جو قومی جماعت ہونے کی مدعی ہے اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ میونسپل اور گورنمنٹ اسکولوں میں ہندی کو لازمی قرار دے لیکن "ہندی" سے انکی کیا مراد ہے، کیا اُن کی مراد اس سے وہ زبان ہے جو صرف دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اگر ان کی مراد یہی ہے تو میں اُن کو بتا دونگا۔ کہ کسی کانگرسی حکومت نے دیوناگری رسم الخط کو لازمی قرار نہیں دیا، یہ صرف "ہندوستانی" زبان ہے جو لازمی قرار دی جائیگی

رسم الخط اختیاری ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اُردو ہو اور ہوسکتا ہے کہ وہ دیوناگری ہو۔

میں مسٹر جناح کی توجہ واردھا اسکیم کیطرف منعطف کرانا چاہتا ہوں جس کو ڈاکٹر ذاکر حسین کا بورڈ بروئے کار لا رہا ہے۔ اُسنے اساتذہ کی تعلیم میں اس امر کو لازمی قرار دیا ہے کہ وہ دونوں رسم الخط کی تعلیم حاصل کریں، اور دونوں کی تعلیم دینے کے قابل ہوں تاکہ ہر طالب علم اس رسم الخط میں مدرس سے تعلیم حاصل کرسکے، جس کو وہ پسند کرتا ہے۔

ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان

کیا مسٹر جناح کی مراد "ہندی" سے وہ زبان ہے جس میں جان بوجھ کر سنسکرت کے غیر مانوس اور عجیب غریب الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے جن کو لوگ عام طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ اگر اُنکی مراد یہ ہی ہے تو میں اُن کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ اس معاملے میں کچھ نہیں جانتے اور جو کچھ وہ جانتے ہیں وہ بالکل گمراہ کُن ہے۔ اُن کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کانگرس جس زبان کو رواج دے رہی ہے، وہ اُردو کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے وہ اُردو جو سادہ وسلیس ہو۔ اور عربی فارسی اور سنسکرت کے غیر معروف اور نامانوس الفاظ سے مبرّا ہو

(زمزم - ۱۵ $\frac{6}{38}$)

اس بیان کی رو سے حضرت مولانا نے مسلمانوں پر واضح کرنا چاہا ہے کہ کانگریس کی قرارداد اور عمل کی رو سے۔

(۱) قومی زبان وہ صاف اور سلیس اُردو ہوگی جو شمالی ہندوستان کے شہروں میں بُولی جاتی ہو

(۲) زبان ایک ہی ہوگی البتہ وہ اُردو اور ناگری دونوں رسوم الخط میں لکھی جائیگی۔

(۳) اس مشترکہ زبان کا نام "ہندوستانی" ہوگا۔

(۴) اس میں عربی۔ فارسی، سنسکرت کے نامانوس اور غیر معروف الفاظ نہیں ہونگے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اُردو سے عربی اور فارسی کے غیر معروف اور نامانوس الفاظ خارج کرکے پوتر بھارت ماتا کی دیوبانی کو شُدھ کرنے والے مولانا آزاد وہی آزاد ہیں جو کبھی الہلال

کے مدیر تھے، اور اُردو کے متعلق جن کا اسوقت خیال یہ تھا کہ:-

اُردو، فارسی کی طرح اپنے علمی ادبیات میں اب تک عربی کے ماتحت ہے۔ اس کا کوئی خاص علمی لٹریچر نہیں۔ اپنی اصطلاحات نہیں۔ جتنی علمی اصطلاحات ہماری زبان میں ہیں۔ سب کی سب عربی ہیں پس اُردو کے تراجم علوم میں الفاظ عربیہ کا استعمال ناگزیر اور اس لیئے سند کے لیئے اردو بول چال نہیں بلکہ عربی لغت اور اصطلاح علوم کا حوالہ مطلوب ہے، ..... (ہم) اردو میں جب کسی علم وفن کو لکھیں گے تو چونکہ اردو اپنی علمی ادبیات میں عربی کے زیرِ اثر اور بکلی ماتحت ہے اسلیئے لامحالہ ہمیں عربی اصطلاحات کو مقدم رکھنا پڑیگا۔ (الہلال ۹/۱۲ ۱۷)

ادبی پہلو کے علاوہ اُردو زبان میں عربی الفاظ کے استعمال کے متعلق حضرت مولانا کے نزدیک ایک اہم پہلو اور بھی تھا۔ فرماتے ہیں:-

"لوگ معترض ہیں کہ مصطلحات اُردو کے لیئے عربی کی مراعات استحقاق پر ہم کیوں زور دے رہا ہوں، یہ کیوں ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ حتے الامکان عربی ہی کے الفاظ اُردو کی ادبیاتِ علمیہ میں استعمال کیئے جائیں لیکن شاید یہ نکتہ اُن کی نگاہوں سے مخفی ہو کہ صرف عربی ہی نہیں، بلکہ ہر علمی زبان اپنی ماتحت زبانوں کے لیئے ایسے ہی حقوق کا مطالبہ رکھتی ہے .... اصطلاحات حدیثہ کا سوال جانے دیجیے، مسلمان آج تمام اطراف عالم میں پھیلے ہیں، اُن کی زبان ہر جگہ ایک نہیں ہے لیکن مصطلحاتِ دینیہ اور علمیہ اب تک ایک ہیں، اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے۔ پھر کوئی سبب نہیں کہ تیرہ سو برس کا استحقاق آئندہ کے لیئے اس سے سلب کرلیا جائے .... عربی اُمِ لغتِ اسلامیہ ہے۔ زندہ ہے اور اپنے بچوں کی پرورش کے لیئے کافی اسباب وسامان اپنے پاس رکھتی ہے"۔

(الہلال مورخہ ۱/۱۲ ۱۵)

کیا ہم حضرت مولانا سے استفسار یافت کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ عربی کا وہ استحقاق جو تیرہ سو سال سے مسلم چلا آتا ہے آج اس کے سلب کرنے کا مجرم کون بن رہا ہے؟ وہ کون ہے جو ام نعمت اسلامیہ کی آغوش سے اس کے بچوں کو چھین کر انہیں براہمن تہذیب کے اناتھ آلیہ (یتیم خانہ) میں داخل کر رہا ہے؟ وہ کون ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان سے عربی۔ فارسی کے الفاظ خارج کر کے اطراف عالم کے مسلمانوں سے ان کے تعلقات ہمیشہ کے لئے منقطع کرنے کی فکر کر رہا ہے؟

اے چشم اشکبار ذرا دیکھ تو سہی — یہ گھر جو بہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

کر دیا جائے گا۔ اردو سے محض عربی و فارسی کے "غیر معروف اور نامانوس" الفاظ خارج کئے جائیں گے۔ تمام الفاظ نہیں لیکن یہ فرمایئے کہ وہ کونسی کسوٹی ہوگی جس پر پرکھا جائے گا کہ فلاں لفظ "غیر معروف" ہے اور فلاں معروف و مانوس۔ جن کے ہاتھ میں وہ کسوٹی ہوگی ان کی تو آج ہی سے یہ روش شروع ہوگئی ہے کہ وہ الفاظ جو صدیوں سے زیر استعمال ہیں اور جن کو بچہ بچہ جانتا ہے انہیں بھی "غیر معروف" قرار دیا جا رہا ہے صوبہ متحدہ کو کون نہیں سمجھ سکتا لیکن وہاں کانگریس حکومت کی وزارت کے ایک زبردست رکن نے یہ تجویز بھی پیش کر دی ہے کہ یہ غیر مانوس لفظ ہے۔ اس کی جگہ "جنت صوبہ" کا مانوس لفظ استعمال کرنا چاہئے معلوم نہیں صوبہ کی جگہ ان کو کوئی "مانوس" لفظ کیوں نہ مل سکا۔ یا مثلاً صوبہ متوسط میں "مدرسہ" جیسے غیر معروف لفظ کی جگہ "ودیا مندر" کا مانوس لفظ سرکاری طور پر وضع کیا گیا ہے: اسی طرح خدمت استقبال۔ انصاف۔ بنیاد۔ عورت۔ مرد۔ جیسے غیر مانوس الفاظ کی جگہ سیوا۔ سواگت۔ نیاؤ۔ نیو۔ استری۔ پرش۔ جیسے مانوس الفاظ بدل کرلائے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ لیکن۔ صرف کی جگہ بھی پرنتو اور کیول نے لے لی ہے۔ غیر معروف نامانوس" الفاظ کو اردو سے خارج کر کے جدید ہندوستانی زبان کی کیا شکل بنائی جا رہی ہے۔ اس کے لئے یو۔ پی۔ کے ایک کانگریس پرست کی شہادت ملاحظہ فرمایئے

اگر مولانا ابوالکلام آزاد جو کانگریس پارلیمنٹری کے ممبر ہیں۔ اور جن کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ کانگریسی نقطۂ نظر سے وزارتوں کا احتساب کریں تکلیف فرما کر ایک بار یہاں کی کونسل میں شریک ہوں۔ اور ان تقریروں کو سنیں جو ہندو ممبروں اور ہندو

وزراء کی طرف سے ادا ہوتی ہیں تو مجھے یقین ہے۔ کہ وہ بھی ضبط نہ کر سکیں گے اور بے اختیار فارسی یا عربی میں تقریر کرنے کھڑے ہو جائیں گے [۱]

یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم بیسویں صدی کے کسی جلسہ میں شریک ہیں بلکہ چندر گپت اور اشوک کے دربار کا منظر سامنے آ جاتا ہے اور مسلمان تو مسلمان ہندو پبلک بھی ۹۰ فیصدی ان تقریروں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ پھر یہ بدعت کونسل ہال اور دفتر وزارت ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اثر عام ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کی کارروائیاں بھی اب زیادہ تر اسی زبان اور اسی رسم خط میں قلمبند کی جاتی ہیں۔ اور مسلمانوں کی دلچسپی کو ہر ہر شعبہ سے کم کیا جا رہا ہے یہاں کی ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی سے بعض مسلمان صرف اس لئے استعفاء دینے پر مجبور ہوئے [۲] کہ دفتر کانگریس سے جو اطلاع اور جو اعلان شائع ہوتا ہے وہ ہندی میں ہوتا ہے درآنحالیکہ لکھنؤ کا ہر ہندو اردو زبان اور اردو رسم خط سے واقف ہے اور اگر کہا جاتا ہے کہ کیوں نہ اردو ہندی دونوں زبانوں میں اعلانات شائع کئے جائیں تو کہا جاتا ہے کہ اس میں مصارف زیادہ ہیں اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ جس وقت سوال کسی اقتصادی یا سیاسی مصلحت کا آئیگا تو سب سے پہلے اس چیز کو محو کیا جائے گا جو مسلمانوں کی قومی کلچر کی سب سے بڑی امانت دار ہے۔" (نگار اگست ۱۹۳۸ء)

ان واقعات سے مولانا آزاد کے دعوےٰ کی اس حقیقت کو بھی معلوم کر لیجئے کہ ہندوستانی زبان اردو اور دیوناگری دونوں رسوم الخط میں لکھی جائے گی یہ باتیں تو وہ ہیں جو نمایاں طور پر سامنے آ جاتی ہیں لیکن ان کوششوں سے زبان میں جو تبدیلی غیر محسوس طور پر واقع ہو رہی ہے اس کا اندازہ غور اور تدبر کا محتاج ہے آپ کسی سینما ہال میں جائیے اور سنئے کہ وہاں فلم میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ کس دیش کی بھاشا ہے۔ حالانکہ تماشائیوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہوتی ہے۔ یعنی ہندی کا پروپیگنڈا اس روپے سے ہوتا ہے جس کا

---

[۱] اب تو یہ مولانا آزاد کے متعلق حسن ظن ہی ہے ورنہ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ منہ

[۲] الحمد للہ کہ ان میں اتنی حمیت باقی تھی۔ منہ

بیشتر حصہ خود مسلمانوں کی جیب سے جاتا ہے۔ یا کسی شام ریڈیو کے پاس بیٹھ کر سنئے کہ غیر محسوس طور پر زبان کہاں سے کہاں چلی گئی ہے۔ مقررین کو چھوڑئیے۔ خود براڈ کاسٹنگ اسٹیشن (محطہ نشر الصوت) سے (جو محکمہ ابھی مرکزی حکومت کے ماتحت ہے) جو خبریں نشر کی جاتی ہیں ان میں بھی سواگت۔ سیوا۔ اور سماج جیسے الفاظ بلا تکلف استعمال ہونے شروع ہو گئے ہیں حتیٰ کہ ان کے مطبوعہ پروگرام میں بھی "مجلس" کی جگہ سبھا کا لفظ آ چکا ہے۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ صوبۂ متوسط میں مدرسہ کی جگہ ودیا مندر کا نام سرکاری طور پر وضع کیا گیا ہے مولانا آزاد سے دریافت کیا گیا کہ صاحب! آپ تو فرماتے تھے کہ اردو زبان سے عربی۔ فارسی کے غیر مانوس الفاظ نکالے جائیں گے۔ یہ مدرسہ کونسا غیر معروف لفظ ہے جس کی جگہ ودیا مندر جیسا مشہور و معروف لفظ تجویز کیا گیا ہے تو اس پر آپ نے فرمایا کہ مسلمان اسے بیت العلوم کہہ لیا کریں۔ جھگڑا ختم ہوا۔ سرکاری نام تو ودیا مندر ہی رہیگا۔ لیکن یہی سوال جب مسٹر شکلا سے کیا گیا جو ودیا مندر سکیم کے روحِ رواں ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ

ودیا مندر اپنے اندر کئی کششیں رکھتا ہے۔ صوبہ کی ننانوے فیصدی آبادی کے لئے یہ روحانی وجدان کا ذریعہ اور ان کے جذبۂ خیر کو ابھارنے کا باعث ہوگا (ودیا مندر سکیم ـ بحوالہ انقلاب مورخہ ۲۹ ؍ ۳ ؍ ۴۹ء)

آپ نے دیکھا کہ ایک نام کی تبدیلی سے کسی قوم کے بچوں کے جذبۂ روحانی پر کیا اثر پڑتا ہے یہ تو تھا ہندو بچوں کے جذبات کا احترام لیکن اسی صوبہ میں دادر کی میونسپل کمیٹی نے اردو سکول کا نام اردو ودیا مندر رکھدیا تو مسلمانوں نے اس تبدیلی نام کے خلاف احتجاج کیا۔ کونسل میں سوالات ہوئے۔ تو ان کے جواب میں وہی مسٹر شکلا فرماتے ہیں کہ نام بیشک بدل دیا گیا ہے لیکن نام کے بدل دینے سے مسلمانوں کی تہذیب پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے کسی فرقہ اور مذہب کے جذبات کو صدمہ پہنچانا مقصود ہے" (مسلم لیگ مورخہ ۴ ؍ ۳ ؍ ۴۹ء) یعنی اردو لفظ کی جگہ ہندی لفظ کا استعمال ہندو بچوں کے لئے روحانی وجدان کا ذریعہ اور جذبۂ خیر ابھارنے کا موجب تو بن جاتا ہے لیکن مسلمانوں کے بچوں کو اس سے کوئی روحانی کاوش نہیں

ہوتی، یہ ہے مسلمانوں کے جذبات کا احترام!! اور اس پر مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی شکایات ودیا مندر کے نام سے عبث ہیں" (انقلاب بابت ۲۹) خدا جانے حضرت مولانا کے نزدیک ہندوں کے خلاف مسلمانوں کی کوئی شکایت بھی معقول ہوسکتی ہے یا نہیں؟ معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ جب سے وہ مسلمانوں سے الگ ہوکر کانگریس میں جا ملے ہیں، مسلمانوں کی قوم، سب باتیں نامعقول اور بیجا کرنے لگی ہے۔

انجمن ترقی اُردو (دکن)، نے اپنے کچھ مبلغ صوبہ متوسط میں بھیجے کہ وہ بچشم خویش وہاں کے حالات کا مطالعہ کرکے صحیح صحیح اطلاعات بہم پہنچائیں۔ ان میں سے ایک مبلغ، سید شیر علی حاتمی نے الہ آباد میں ایک تقریر کے دوران میں بتایا کہ صوبہ متوسط میں ابھی سے یہ حالت ہوچکی ہے کہ مانڈہ ہونا ضلع چھندواڑہ کے اسکول میں ہندو اور مسلمان بچوں کو ہر صبح پرارتھنا کرنی پڑتی ہے، سامنے سرسوتی کا بُت لاکر رکھ دیا جاتا ہے، سب بچے اس بُت کے سامنے گیان اور ودیا پراپت ہونے کی پرارتھنا کرتے ہیں۔ اگر کسی مسلمان بچے کو آپ سلام کریں تو جواب میں وہ "نمستے" اور "جے رام جی" کی ہی کہے گا۔ (انقلاب۔ مورخہ ۱۰)

یہ بھی واضح رہے کہ ودیا مندر کی اسکیم کی رو سے وہاں بچوں کو ہندی لازمی طور پر سکھائی جاتی ہے (ایضاً) اس واقعہ کو سامنے رکھیے اور مولانا آزاد کے بیان پر پھر ایک نگاہ ڈالیے جس میں اعلان کیا گیا ہے کہ کوئی رسم الخط جبری نہیں ہوگا۔

یہ تو تھا ہندی ترویج کا معاملہ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُردو کی تخریب کے متعلق بھی وہاں کچھ کمی نہیں کی جارہی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو (دکن) اپنے ایک بیان میں رقمطراز ہیں:۔

"اب کانگریس حکومت کی نظرِ عنایت ملاحظہ ہو۔ اس زرّیں عہد میں ضلع بیتول کا واحد اُردو مدرسہ ہندی اسکول میں ضم کردیا گیا ہے۔ آٹھنیر کا اُردو اسکول توڑ دیا گیا ہے اور کوتریہ کے ورنیکلر مڈل اسکول سے اُردو کو نصاب سے خارج کردیا گیا ہے۔" (انقلاب ۲۲)

اور اسپر مولانا آزاد مسلمانوں کو ڈانٹ بتاتے ہیں کہ تم خواہ مخواہ شور مچاتے ہو

پھر مولانا آزاد کا بیان ہے کہ زبان ایک ہی ہوگی البتہ دو مختلف رسوم الخط (اُردو اور دیوناگری) میں لکھی جائیگی لیکن عمل اسپر یوں ہو رہا ہے کہ یوپی کی کانگرسی حکومت کے ماتحت کتب قوانین کے جو تراجم "ہندوستانی" میں شائع ہو رہے ہیں اُن میں جو کتابیں دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں اُن کی زبان اور ہوتی ہے اور جو اُردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں اُن کی اور۔ (نگار بحوالۂ احسان ہمدم)

پھر حضرت مولانا نے کانگریس کا فیصلہ بھی بیان فرمایا ہے کہ اس مشترکہ زبان کا نام ہندوستانی ہوگا لیکن ہم مہاتما گاندھی کی تقریر مدراس میں دیکھ چکے ہیں کہ وہ اس بات پر بڑی شدت سے مصر ہیں کہ زبان کا نام "ہندی اتھوا ہندوستانی" ہوگا اور جب مولوی عبدالحق صاحب نے اسپر اعتراض کیا تو مہاتما جی کا اصرار اور بھی بڑھ گیا۔ اور انھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں اس میں سے "ہندی" کا لفظ نکالکر صرف "ہندوستانی" نام رکھنا کبھی گوارا نہیں کرونگا۔ چنانچہ اُنکے نزدیک اسکا نام "ہندی اتھوا (یعنی) ہندوستانی ہی ہے"، یعنی اصل نام تو ہندی ہے! البتہ اسی کو عرف عام میں "ہندوستانی" بھی کہہ لیا جاتا ہے۔ مہاتما جی سے کسی نے نہیں کہا کہ لفظ "ہندی" پر اصرار فرقہ پرستی کا آئینہ دار ہے، بلکہ ڈاکٹر اشرف ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ انہیں ایسا کرنے کا پورا حق حاصل ہے البتہ اسکے خلاف کچھ کہنا یہ فرقہ پرستی ہے۔ اگر کہیں مسٹر جناح یہی طرزِ عمل اختیار کرلیں اور کہہ دیں کہ اس زبان کا نام "اُردو یعنی ہندوستانی" رکھا جائے تو آپ دیکھیں کہ کس طرح شور مچا دیا جاتا ہے کہ یہ فرقہ پرستی ہے، رجعت پسندی ہے، ٹوڈیت ہے۔ علیحدگی کا رُجحان (SEPARATIST TENDENCY) ہے متحدہ قومیت کی تشکیل کے خلاف ہے اور خدا جانے کیا کیا ہے۔

پھر مہاتما گاندھی کی تقریر مدراس میں آپنے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ اُنکے نزدیک "ہندی اتھوا ہندوستانی" وہ زبان ہوگی جو جنوبی ہند کی زبانوں سے قریب تر ہوگی اور اس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ ہونگے۔ لیکن بایں ہمہ مولانا آزاد مسلمانوں کو یقین دلا رہے ہیں کہ یہ جدید زبان صاف اُر

سلیس زبان ہوگی جو شمالی ہند کے شہروں میں بولی جاتی ہے اور جس میں عربی - فارسی اور سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ نہیں ہوں گے - یعنی مہاتما جی زبان کی گاڑی کو مدراس کی طرف لئے جارہے ہیں اور مولانا صاحب مسلمانوں سے کہ رہے ہیں کہ نہیں یہ تمہاری نگاہ کی تنگ نظری کا ثبوت ہے تم یہی سمجھو کہ گاڑی لکھنؤ کی طرف آرہی ہے - اور جو شخص اپنی آنکھوں سے گاڑی کو دیکھکر کہدے کہ نہیں صاحب یہ تو ہمارے سامنے مدراس کی طرف جارہی ہے شمال اور جنوب کا فرق کوئی ایسا غیر محسوس فرق نہیں ہے جسے ہم یوں پہچان نہ سکیں تو کہدیا جاتا ہے کہ تمہیں تعصب اور فرقہ پرستی نے اندھا کر دیا ہے - گاڑی شمال ہی کی طرف آرہی ہے - خدا کرے کہ کہیں ان حضرات کو بھی وہی آنکھیں مل جائیں جن سے جمہور مسلمان دیکھتے ہیں پھر ان سے پوچھیں کہ گاڑی کدہر جارہی ہے -

کیا جانئے کیا کہتا - کیا دیکھتا - کیا کرتا زاہد کو بھی گر دیتا مجھ جیسی خدا آنکھیں

مسلمانوں کا طرز عمل

ہندوؤں کے متعلق تو آپنے دیکھ لیا کہ وہ اردو زبان کو ہندی بنا دینے میں کس برق رفتاری کے ساتھ بڑہتے چلے جارہے ہیں - انہیں اس بات کی قطعًا کوئی پرواہ نہیں کہ مسلمان اس باب میں کیا کہہ رہے ہیں (اور ہو بھی کیوں ! انہوں نے مسلمانوں کی دوستی کا دم کس دن بھرا تھا جو ان سے اس قسم کی توقع کی جائے ، لیکن اس کے مقابلہ میں اردو کو شدھ کر دینے میں خود مسلمانوں کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہندوؤں کے مقصد کو قریب تر لانے میں اور بھی زیادہ ممد و معاون بن رہا ہے - مسلمان مقررین مصنفین جرائد و رسائل محض ہندوؤں کو خوش کرنے کی خاطر اب آہستہ آہستہ اس قسم کی زبان استعمال کرنے لگے ہیں جس زبان کا آج سے دس برس پیشتر کہیں پتہ نہیں چلتا اس کی بہترین شہادت نند لال جی الہ آبادی کا وہ خط ہے جو انہوں نے ۲۴ ستمبر ۱۹۳۶ء کو مہاتما گاندھی کے نام لکھا تھا اور اب تو حالت بد سے بدتر ہوگئی ہے وہ فرماتے ہیں :-

اُردو رسالوں میں وِدوان (عالم) مسلمان مصنفوں کے لیکھ اس مضمون کے برابر نکلتے رہتے ہیں کہ ہمیں اُردو سے عربی اور فارسی کے غیر مانوس شبدوں کو نکال کر ہندی کے عام فہم شبدوں کا استعمال کرنا چاہیئے۔ ایک مسلم اُردو رسالہ کی زبان پر کسی کٹر مسلمان نے اعتراض کیا۔ آپ کو تعجب ہوگا، وِدوان (عالم) ایڈیٹر نے جواب دیا کہ "میں حجازی اُردو سے اپنے رسالہ کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا" اِس چیز پر عمل بھی جتنی کامیابی کے ساتھ آج کل اُردو رسالوں میں ہو رہا ہے۔ کسی ہندی رسالہ میں نہیں ہو رہا ہے' لاہور کے رسالۂ نیرنگ خیال سے میں نے اُردو نظم و نثر کے چند نمونے اپنے لکھن بھارت ہندی پرچار سبھا کے کانوکیشن ایڈریس میں نقل کیے تھے جنہیں اگر آپ جوں کا توں حرفوں میں کسی ہندی رسالے میں شائع کرا دیں تو کسی بھی پڑھنے والے کو یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ اُردو سے لیئے گئے ہیں۔ یہ سب مسلمانوں کے لکھے ہوئے ہیں، مجھے شک ہے کہ کسی ہندی رسالے سے شاید کوئی ایک نمونہ بھی ایسا نہیں نکالا جا سکتا...

آپ خود کسی وقت آئندہ کی ہندوستانی زبان کے لحاظ سے سُندر ملی جلی زبان بولا کرتے تھے کہ جسے سُنکر اُردو داں اور ہندی داں دونوں کا دل خوش ہو جاتا تھا دونوں سمجھتے تھے لیکن ناگپور کی جو آپ کی تقریر جوں کی توں دلی کے جامعہ میں چھپی ہے وہ چیز نہیں ہے + (جامعہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کو اس کی ضرورت سے زیادہ رواداری نے اکثر تباہ کیا ہے۔ رواداری بڑی عمدہ چیز ہے۔ بشرطیکہ خودکشی پر آمادہ نہ کر دے ــــ دوسرے معاملات کی طرح زبان کے معاملہ میں بھی یہ اپنی اسی رواداری سے کام لے رہا ہے، ہاتھ باندھ کر منتیں کرتا چلا جا رہا ہے کہ مہاراج! ہم اُردو کا نام بدلے دیتے ہیں۔ ہم اسکے رسم الخط کو بھی درست کر لیں گے مگر ہم توبہ کرتے ہیں کہ اس میں عربی فارسی کے الفاظ بھی نہیں لائیں گے، آپ خود دیکھ لیجئے کہ ہم ہندی کے الفاظ کس کثرت سے اس زبان میں داخل کر رہے ہیں ہم آپ کے پرساد کا سواگت کرتے ہیں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں سار

ہندوستان کی جنتا کے سماجی سدھار کے لئے۔ پرنتو آپ سے کیول اتنی آشا ہے کہ ہمیں اس بھاشا کو زندہ رکھنے کی آگیا دے دیجئے"۔ یہ روش بڑی تباہ کن ہے۔ اس کا کوئی مفید اثر قوم پرستوں" پر نہیں پڑ سکتا۔ ان کو آپ کی زبان کی "دشواریاں" اس کے بدلنے پر مجبور نہیں کریں بلکہ وہ جذبہ اندر ہی اندر کام کر رہا ہے جس کے تحت اسپین کے عیسائیوں نے مسلمانوں کی نادرۂ روزگار عمارات کے حسین و جمیل نقوش کھرچ ڈالے تھے، اس لئے نہیں کہ ان کو آرٹ سے کوئی دشمنی تھی، بلکہ صرف اس لئے کہ اسلامی خون رکھنے والی نسلوں میں ان نقوش سے اپنے ماضی کی اور اپنی قومیت کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ بالکل اسی جذبہ کے تحت زبان سے "علیحدگی پسندی کے رجحان" کو مٹانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں اور مسلمان سمجھ رہا ہے کہ رواداری سے کوئی بین بین راستہ پیدا ہو جائے گا۔

تم ریڑھ کی ہڈی کے بغیر محض نرم گوشت بن کر اپنی جگہ کھڑے نہیں رہ سکتے۔ اگر استقامت چاہتے ہو تو اپنے اندر ریڑھ کی ہڈی پیدا کرو۔ جب تم سے کہا جا رہا ہے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے" تو کیوں نہیں کہتے کہ ہاں صاحب! یہ ہماری زبان ہے۔ ہماری زبان رہے گی۔ اور جب تک ہم موجود ہیں اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔

یاد رکھئے زبان کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں جسے آپ یونہی ایک نظری بحث (ACADEMIC DISCUSSION) قرار دے کر آگے گذر جائیں اور اُردو زبان پر تاریخی مقالات لکھ کر مطمئن ہو جائیں کہ آپ نے دلائل و براہین سے ثابت کر دیا کہ اردو ہی ہندوستانیوں کی مشترکہ زبان قرار پا سکتی ہے۔ یہ بحث اس سے کہیں زیادہ اہم ہے اور اس لئے کہیں زیادہ قوت عمل کی محتاج۔ ذرا غور فرمائیے کہ آپ کے اسلامی تمدن اور مذہب کا تیرہ سو سال کا ذخیرہ اوّلاً عربی زبان میں ہے۔ ہندوستان کا مسلمان سوائے عربی مکاتب کے چند طالبعلموں کے، اس ذخیرہ سے بالکل ناآشنا ہو چکا ہے۔ اور اس لئے اپنے متعلق "معلومات کے لئے مغرب کے مستشرقین کا محتاج ہے۔ وہ جس قسم کی

معلومات بہم پہونچاتے ہیں، اربابِ علم سے پوشیدہ نہیں پھر اس خزانہ کا کچھ حصہ فارسی زبان میں ہے۔ یہاں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس سے بھی بے بہرہ ہو چکا ہے۔ اس کے نزدیک کتب عربی اور فارسی کس درجہ مہمل ہو چکی ہے۔ اس کا نظارہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کسی کباڑی کی دوکان پر دیکھئے۔ نادرۂ روزگار کتابوں کے ڈھیر کے ڈھیر ردی کے بھاؤ بکتے ہیں۔ جمع شدہ ذخیرہ یوں ضائع ہو رہا ہے اور آئندہ ایک کتاب بھی ان زبانوں میں یہاں نہیں چھپتی۔ چھپے کس کے لئے؟ عربی اور فارسی یوں ختم ہوئی۔ اس کے بعد کچھ تھوڑا سا سرمایہ علمی اردو میں منتقل ہوا تھا۔ اب جس وقت آزاد ہندوستان کی زبان ہندی (یا براہ فریب نگاہ ہندوستانی) ہو گئی تو آپ دیکھیں گے کہ چند ہی سال کے عرصہ میں اردو کا تمام ذخیرہ بیلچہ آثار قدیمہ والوں کی نذر ہو جائے گا جس طرح آج عربی اور فارسی کا ہو چکا ہے۔ اور اور جب کوئی قوم اپنے اسلاف کے سرمایۂ علمی سے محروم ہو جاتی ہے تو پھر اس کی اپنی تہذیب۔ تمدن۔ لٹریچر سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ انگریزوں نے یہاں پہونچکر نہ تو انگریزی کو بالجبر رائج کیا۔ نہ عربی۔ فارسی کو جبراً اسکولوں سے خارج کیا۔ لیکن ایک سو سال کے عرصہ میں جو کچھ تبدیلی یہاں ہو گئی وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اپنی زبان پر غیروں کی زبان کے غالب آ جانے سے قوم کی ذہنیت بدل گئی۔ اور قوم کی قوم علمی سرمایہ کی اس متاعِ گراں بہا سے تہی دامن ہو گئی جو صدیوں سے اس کے لئے مایہ ناز تھی۔

رسم الخط کا مسئلہ

پھر مسلمان کے لئے رسم الخط کا مسئلہ اس سے بھی اہم ہے۔ اردو کا رسم الخط (دائیں سے بائیں طرف) عربی رسم الخط ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں ہندی رسم الخط (بائیں سے دائیں طرف) سنسکرت کا رسم الخط ہے۔ آپ کا رسم الخط تمام عالم اسلامی کے ساتھ آپ کا تعلق پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مسلمانوں کے بین الاقوامی تعلقات (جسے پان اسلامزم کا ہوّا بنا کر ڈرایا جاتا ہے) ہندوؤں کی نگاہ میں ہمیشہ سے کھٹکتے رہے ہیں۔ یہ تمام "معصوم کوششیں" جو بتدریج اردو رسم الخط کی جگہ ہندی رسم الخط کی

ترویج کی طرف کشاں کشاں لیے جا رہی ہیں در اصل اسی جذبہ کا مظاہرہ ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کو باقی عالم اسلامی سے الگ کر کے انھیں ہندی قومیت میں جذب کرنے کے لیے ہر ہندو کے دل میں موجزن ہے۔ یہ اتنا بڑا خطرہ ہے کہ اگر ہندوستان کے مسلمان بر وقت آگاہ نہ ہوئے اور قومیت پرست مسلمانوں کے ہمدردی سے لبریز بیانات پر بھروسہ کرتے رہے تو یاد رکھیں کہ وہ اپنی اصل سے اس طرح کٹ جائیں گے جس طرح فصل خزاں میں ایک شاخ درخت سے ٹوٹ کر گر پڑتی ہے اور جس کے لیے پھر کبھی مژدۂ بہار نہیں ہوتا لیکن جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے مصیبت تو یہاں خود اپنوں کی لائی ہوئی ہے۔ سی۔ پی میں اگر ہندی کی تعلیم لازمی کر دی گئی ہے تو مسلمانوں کو اس سے اتنی ہی شکایت ہو سکتی ہے کہ کانگریس باوجود قومی جماعت کے ادعا کے خالص "فرقہ وارانہ" اقدام کر رہی ہے لیکن سینۂ مسلم کا ناسور تو اس وقت رستا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ دہلی کے جامعہ ملیہ میں جو ایک آزاد اسلامی درسگاہ ہونے کی مدعی ہے۔ ابھی سے ہندی کی تعلیم جبری کر دی گئی ہے۔ جب اپنوں کی یہ حالت ہو تو غیروں کا کیا شکوہ!!

کہدیا جا سکتا ہے "کہ تم نے انگریزی بھی تو سیکھی تھی جبکا رسم الخط اردو سے مختلف تھا" لیکن انگریزی سیکھنا تو غلامی کی لعنتوں میں سے تھا اگر آزادی کی برکات کا نتیجہ بھی وہی کچھ ہوا تو دونوں میں فرق کیا ہوا؟ پھر انگریزی ہندوستان کی متحدہ زبان نہیں قرار دی گئی تھی وہ حاکم قوم کی زبان رہی تھی۔ اگر ہندو یہ اعلان کر دیں کہ ہندی ہندوستان کی اکثریت کی زبان ہے، جسکے ہاتھ میں نظام حکومت ہوگا اس لیے اقلیتوں کو یہ زبان بجبر سیکھنی پڑیگی تو بات صاف ہو جائے اس مقصد کو "متحدہ قومیت کے مشترکہ مفاد" کے نقاب میں کیوں پیش کیا جا رہا ہے؟

پھر کہدیا جاتا ہے کہ ترکوں نے اپنا رسم الخط ترک کر کے لاطینی رسم الخط اختیار کر لیا ہے جو عربی رسم الخط سے مختلف ہے تو تم بھی ایسا کر لوگے تو کیا حرج ہوگا سو اول تو ترکوں کے حالات

ہم سے مختلف ہیں۔ انکی حکومت اپنی ہے۔ زبان اپنی ہے۔ انھوں نے معلوم نہیں کن مصالح کی بنا پر رسم الخط کو بدلا ہے لیکن ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا ترکوں کا ہر فیصلہ ہمارے لئے سند ہے؟ ہم اپنے فیصلے اپنے حالات کے مطابق خود کریں گے۔ ہمارے فیصلے ہندو اکثریت کیوں کرے؟

بعض حضرات کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہم ہندی رسم الخط اختیار کر کے اپنا تمام لٹریچر ہندی میں منتقل کر دیں گے اور اس طرح اسے ہندوؤں تک پہنچا کر اپنے مذہب اور تہذیب کی تبلیغ کر سکیں گے۔ بگلہ پکڑنے کا یہ طریق ایسا "استادانہ" ہے جسکی جسقدر بھی داد دی جائے کم ہے۔ آج جتنے ہندو اچھی طرح سے اُردو لکھ پڑھ سکتے ہیں پوچھئے کہ وہ آپکے اسلامی لٹریچر کو کتنا پڑھتے ہیں اور انکے خیالات کو آپنے کس حد تک متاثر کیا ہے؟

پھر کہا جاتا ہے کہ اُردو میں ۸۰ فیصدی الفاظ ہندی کے ہیں اس لئے اسے ہندی میں تبدیل کر دینے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے! لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ جب اُردو میں ۸۰ فیصدی الفاظ ہندی کے ہیں جو ہندوؤں کی آبادی کے تناسب سے بھی زیادہ ہیں تو اسی زبان کو قومی زبان کیوں نہ قرار دیا جائے۔ مسلمانوں کا تو اس میں پھر بھی بیس فیصدی ہی حصہ رہیگا لیکن ہندو تو اتنا بھی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ تو اسے سو فیصدی ہندی بنانا چاہتا ہے اور رسم الخط وہ اختیار کرنا چاہتا ہے جو دنیا میں اس کے سوا اور کوئی نہ سمجھے۔ معلوم نہیں حکومت حاصل کیے یہ باقی دنیا سے کس رسم الخط میں خط و کتابت کیا کریں گے؟ اُردو رسم الخط سے تو پھر بھی کم و بیش آدھی دنیا واقف ہے۔

نمونہ "ہندوستانی"

آخر میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس "ہندوستانی" کا نمونہ بھی دکھا دیا جائے جو آپ کے آزاد ہندوستان کی مشترکہ زبان بننے والی ہے۔ بھارت ساہتیہ پرشد کے اجلاس ناگپور منعقدہ اپریل ۱۹۳۵ء کی صدارت کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا وہ یوں شروع ہوتا ہے:۔

"اس بھاشا کا سبھا پتیتو دینے کا کارن جب میں ڈھونڈھتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساھتیہ کار نہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دولیش کا کارن ہونا۔ تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو۔ میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بھوشیہ میں اپنا سیتو اکیشتر بڑھا دیں گے۔ یدی ہم شری نگر سے لیکر کھنیا کماری تک اور کراچی سے لیکر ڈبرو گڑھ جو بردیش ہو اسے ایک مانتے ہیں اور اسکے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساھتیہ کار بھاشا شاستری تیاوی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی سیوا کیوں نہ کریں (رسالہ جامعہ مئی ۱۹۴۶ء)

یہ ہے وہ مولانا آزاد کے بیان کے مطابق صاف و سلیس اردو جو شمالی ہند کے شہروں میں بولی جاتی ہے۔
اس سے بھی دلچسپ ایک اور نمونہ ہے۔ بہار کے وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود نے "ذریعہ تعلیم کے متعلق جو حکم حال ہی میں صادر فرمایا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں۔

ہندوستانی زبان کو سنسکرت سے بھرنے یا فارسی سے ملانے کے خلاف اکثر یورپین اور ہندوستانی فضلا نے آوازیں بلند کی ہیں جن میں چند کے نام حسب ذیل ہیں ....

...... میں ان میں سے فقط دو حضرات یعنی پنڈت گردھر شرما۔ اور مولانا وحید الدین سلیم کے خیالات درج کرتا ہوں۔ پنڈت جی فرماتے ہیں:۔

"سنسکرت مایا بنا کر آپنے بنگال۔ مہاراشٹر آدی میں ہندی کا پرچار کریں کنتو (لیکن) وہ کیول شکشیتوں (پڑھے لکھوں) کی بھاشا (زبان) بن گئی۔ سرو سدھارن (عوام) اسے بالکل نہ سمجھ سکے۔ تو کیا لابھ (فائدہ) ہوا۔ لابھ کیا بڑی ہانی (نقصان) ہو گئی ...... ہندی بھاشا میں ہندی بھاشا کے شبد (الفاظ) ہی پرتھام لینی چاہئے۔ لیکن جب ان سے آوشکتا (ضرورت) پوری نہ ہو تب سنسکرت بھاشا سے سرل (آسان) شبد (الفاظ) لینے چاہئیں"
(کلیم بابت اگست ۱۹۴۶ء)

یعنی پنڈت جی نے ہندوؤں کو نصیحت کی ہے کہ ہندی زبان کو ایسا سلیس لکھو کہ اس میں سنسکرت کے

غیر مانوس الفاظ نہ آئیں لیکن جس زبان میں انہوں نے خود یہ پیغام دیا ہے اس کے سمجھنے کے لئے مہاراج بکرماجیت کے کسی نورتن کی ضرورت ہے۔ یہ ہے نمونہ آسان اُردو کا جو آپ کی مشترکہ زبان بنیگی۔ مولانا آزاد ان باتوں کے متعلق کسی بیان کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ہندوؤں کے جی میں جو کچھ آئے کریں وہ معقول اور حق بجانب ہے۔ البتہ کبھی مسلمان کوئی شکایت کرے تو انہیں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہندوؤں کی صفائی پیش کردیں۔ ان مثالوں کو شاید کوئی یہ کہہ کر مسترد کردے کہ یہ کوئی مستند تھوڑی ہیں؟ آیئے ہم آپ کو ایک ایسا نمونہ دکھائیں جس کے مستند ہونے میں کسی کو کلام نہ ہو۔ صوبہ متحدہ کی کانگریسی حکومت کے وزیر تعلیمات آنریبل سری سمپورنانندجی نے ایک تقریر کی جس کا ترجمہ "ہندوستانی" زبان میں فوراً گورنمنٹ کے محکمۂ اطلاعات نے شائع کیا ہے۔ اس کے مستند ہونے میں تو کسی قسم کا شبہ نہیں ہوسکتا؟ ملاحظہ فرمایئے کہ یہ کونسی زبان میں ہے۔ واضح رہے کہ یہ زبان اس لکھنؤ سے شائع ہورہی ہے۔ جو ہندوستان بھر میں اردو کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ تقریر مع عنوان یہ ہے۔

"شکشا سنگھٹن سمیت کے سمکش سنکیت پرانت کے شکشا منتری مانئے سری سمپورنانندجی کا دیاکھیان (پرکاش دبھاگ سنکیت پرانتے، گورنمنٹ)

ادھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک لبشستا ہے کہ شکشنز شمیا کے پرت لوگوں کا آکرشن بیت وشدہ اور بیاپک ہوگیا ہے۔ یہ بات ادھکانش سبئے سنسار پر گھٹت ہوتی ہے اور ترن سار ہم اپنے دیش میں بھی اس لشیو بیاپی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں اگر ان کا ان بھون کررہے ہیں۔ آجکل ہم اپنے کو جس سماجک اور راجنیتک پرسنگت میں پاتے ہیں اور ہماری اس اسنگت کا جو سماجک راجنیتک اور آرتھک ادہار ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے پوروجوں سے جو سنسکرت پائی ہے اس سے اس وشیو دیاپی پرگت کو ہمارے سنسکرنش مندیہ ایک بشیش روپ میں اسنگت کیا ہے اور ایک وشیش بھارتیہ سمیہ بنادیا ہے" ذرا آواز دیجئے مولانا آزاد صاحب کو اور ان سے پوچھئے کہ "ٹیلیس اُردو" جسے جنترمنتر والوں کی اصطلاح میں "کالا علم" کہا جائیگا

شمالی ہندوستان کے کس شہر میں بولی جاتی ہے ؟

باب دوم

کچھ اپنوں سے

آپنے دیکھا کہ اس آئینی تبدیلی کے دور میں "حصولِ آزادی" کی آڑ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی امتیازی خصوصیات مٹانے کے لئے ہندو اکثریت جو طریق کار اختیار کر رہی ہے۔ اس میں زبان کی تبدیلی کتنا زبردست حربہ ہے۔ لیکن سوال صرف یہی نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں؛ اصل سوال یہ ہے کہ وہ مسلمان جو ہندوستان میں مسلمان بنکر رہنا چاہتے ہیں اور اپنی آنیوالی نسلوں کو مسلمان بنا کر رکھنا چاہتے ہیں انھیں کیا کرنا چاہیئے۔ تحفظ زبان کے بارے میں ہمارے سامنے کیا تعمیری پروگرام ہونا چاہیئے اسکے متعلق کسی دوسری صحبت میں گزارش کی جائیگی۔ اس وقت ہم چند باتیں اپنی "ادبی برادری" سے کرنا چاہتے ہیں کہ اس معاملہ میں سب سے اہم ذمہ داری انہی پر عائد ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم زبان چاہتے کس لیے ہیں؟ زبان بذاتِ خود تو کوئی اہم چیز نہیں ہے اسلئے محض اس کا تحفظ مقصود بالذات قرار نہیں دیا جاسکتا۔ زبان کا تحفظ ہم اسلئے چاہتے ہیں کہ اسکے ذریعہ ہمارے تمدن۔ ہمارے کلچر کی حفاظت ہوتی ہے لیکن کیا جو کچھ آجکل عام طور پر ہماری ادبی پیداوار ہے وہ ایسی ہی ہے جسے اسلامی تمدن اور اسلامی ثقافت کا آئینہ دار کہا جاسکے؟ جواب ظاہر ہے! ہمارے نوجوان لکھنے والوں میں ایک جماعت تو ایسی ہے جس نے اپنی تمام مساعی کو اس بات کے لیے وقف کر رکھا ہے کہ مذہب اور شعائر ملت کے خلاف "جہادِ عظیم" کیا جائے۔ اوّل تو کالجوں کی تعلیم ہی اس نہج پر رکھی گئی ہے کہ بی اے کرنے تک دماغ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہوجاتا ہے اس پر آزادی ہند کے قائداعظم کے یہ ارشادات کہ ملک میں جس قدر مصائب موجود ہیں اُن سب کا ذمہ دار مذہب ہے؛ نوجوانوں کو مذہب کی مخالفت نہیں بلکہ تضحیک و تمسخر کے لیے بالکل

مسلح کردیتے ہیں پھر وہ اشتراکیت کی ایک خیالی جنت کے نشہ میں اس قدر مدہوش و بے باک ہو جاتے ہیں کہ سوقیانہ استہزاء اور بازاری تمسخر اُنکے نزدیک عین معیار شرافت قرار پا جاتا ہے ، اور اس بدمستی میں بقول یلدرم اُنکے مُنہ سے لچرے فحش کے ایسے بھبکے نکلتے ہیں کہ نکیرین بھی پناہ مانگیں

ایک اور جماعت ہے جو جدید رومانیت کی علمبردار ہے ہماری قدیم غزل گوئی کے خلاف ان کا وعظ سُنیئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتذال اور سوقیانہ پن کا لفظ تک سُننے کے لیئے تیار نہیں ہیں اس شاعری میں انہیں دُنیا بھر کے عیب نظر آئیں گے لیکن انشا ۔ رنگین ۔ جرأت ۔ جان صاحب اور مرزا شوق کو مبتذل اور فحش گو کہنے والے ذرا یہ تو دیکھیں کہ جس قسم کی عریاں فحاشی ان کے افسانوں اور (Sonates) میں آجکل ملتی ہے اُن بے چاروں کے تصور میں بھی اس قسم کے نقشے نہ آسکتے تھے ۔ وہ تو پھر ایک فرضی معشوق کی کنگھی کو ہی نمایاں کرتے تھے ۔ اور آج حالت یہ ہے کہ سچ مچ عشقبازی کی جاتی ہے اور نام لے لے کر واردات قلب کے مرقع تیار کیئے جاتے ہیں جن سے اور کچھ نہیں تو ذہنی تعیش اور دماغی معصیت کوشی کی لذت تو ضرور مل جاتی ہے یہ سب کچھ اس مغربی معاشرت کا نتیجہ ہے جو غیر محسوس طور پر ہمارے نوجوانوں کے قلب و دماغ پر چھا گئی ہے اور جسکے تحت حیا سوز سفلی جذبات کے اظہار کا نام رومانیت رکھا جاتا ہے اگر آپ کو دیکھنا ہو کہ اس رومانیت سے یورپ کی اخلاقی زندگی پر کیا اثر پڑا ہے تو ایک اطالوی مصنف کی کتاب (The Romantic Agony) ملاحظہ فرمایئے پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس قسم کی افسانہ نگاری اور شاعری کا اخلاق کے علاوہ نوجوانوں کی عملی زندگی پر کیا اثر پڑ رہا ہے ایسے نوجوان کا دماغ شروع سے ہی حقایق کی دُنیا میں رہنے کے بجائے ایک افسانوی دُنیا کے تصورات و تخیلات میں محو رہتا ہے ۔ نتیجہ اسکا یہ ہوتا ہے کہ وہ جب دُنیا کی حقیقتوں سے دوچار ہوتا ہے تو ان کو اپنے افسانوی معیار پر پورا اترتے نہیں دیکھتا اس لیئے وہ ان چیزوں سے بیزار ہو جاتا ہے ، یاس و قنوطیت کا المناک فلسفہ اُسکے تمام اعمال و افکار پر چھا جاتا ہے ، اور وہی نوجوان جس کی قوتِ عمل سے قوم کو زندہ ہونا تھا ، خود ایک چلتا پھرتا جنازہ بن کے رہ جاتا ہے ۔

ایک تیسری جماعت اور ہے اور وہ (art for art sake) "آرٹ محض آرٹ کی خاطر" کی قائل ہے یہ اور اسی قسم کے ادیب ایسے مہمل گورکھ دھندے ہیں جو کبھی شرمندہ معنے نہیں ہوتے بے معنے تراکیب۔ بے مطلب۔ فقرے۔ نثرِ منظوم، نظم منثور، ٹیگوری رنگ میں مجذوبوں کی سی بڑیں نہ جن کا سر نہ پاؤں، یا تو یہ لوگ عمداً دوسروں کو بناتے ہیں، یا خود بنتے ہیں، غالب کے تتبع میں غزلیں کہی جاتی ہیں۔ جن میں شوکتِ الفاظ اور ندرت ترکیبات کے زور پر سننے والوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

عصمتِ ناہید وکوثر نو بہارِ نغمہ ہے — شعلۂ جوالۂ مے۔ اعتبارِ نغمہ ہے

بے رنگیں عنبر فشاں۔ مرمریں رنگِ شباب — کیفِ صہبائے تمنا۔ جوئبارِ نغمہ ہے

یا مثلاً نثر میں پیازی اردو کے چھلکے پر سے چھلکا اُتارتے جایئے۔ اندر سے کچھ بھی نہ نکلے:۔

"ریحانۂ نور و سرور کی داستانِ شیریں نغمۂ افسردۂ یاسمین کا بلوریں مجسمہ، گویا قدرت کا ایک حسین خواب تھا جو رشید کی نشۂ شباب میں ڈوبی ہوئی سُنہری راتوں میں بہارِ گلستاں بداماں کیف زانوئے رنگیں پیدا کرتی تھی۔"

مقصد اس طویل داستان سے یہ ہے کہ جب ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو ہماری زندگی کا نصب العین بھی اسلامی ہونا چاہیئے، بالخصوص ایسے وقت میں جب کہ ہم محسوس کر رہے ہیں، کہ ہماری قومیت اور تہذیب کو فی الواقع ایک عظیم الشان خطرہ کا سامنا ہے، یہ وقت وہ ہے کہ جو کچھ جس کے بس میں ہو اس متاعِ گرانمایہ کی حفاظت کے لئے کر گزرے۔ یہی ہماری زندگی کا نصب العین ہونا چاہیئے۔ طریق کار خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، ہماری تمام جد و جہد کا رُخ اسی ایک نصب العین کیطرف ہونا چاہیئے۔ ادیب اپنے ادب سے، شاعر اپنے شعر سے، افسانہ نگار اپنے افسانوں سے، رسائل اپنے صفحات سے، خریدار اپنے ذوق ادب و شعر سے، غرض ہر مسلمان اپنے اپنے دائرۂ امکان میں اپنی ہر کوشش اسی مقصد کے حصول میں صرف کر دے، ہمارے رسائل میں "مذہبی" اور "ادبی" کی تفریق دراصل اُس تفریق پر مبنی ہے جو کلیسا اور سلطنت کی تفریق سے پیدا ہوتی ہے، اور جو یکسر غیر اسلامی

تفریق ہے، ہمارے ہر پرچہ کو اسلامی ہونا چاہیئے، اور اس کی ادبی و صحافتی خدمات اسی عنوان کی تفسیرات ہونی چاہیئں۔ ادب پسند حضرات کو بھی اس تبدیلی نصب العین سے قطعاً نہیں گھبرانا چاہیئے کیونکہ "اسلامیات" اور "مولویات" میں درحقیقت بہت نمایاں فرق ہے، لیکن آج کل ہمارے ہاں یہ حال ہو رہا ہے کہ کوئی پرچہ جو اپنی پیشانی پر "علمی و ادبی مجلّہ" کا عنوان لکھ لیتا ہے، اسلام اور مسلم کا لفظ بھی اس کے اندر لکھنا کفر سمجھتا ہے ہیں ادب و شعر کی اہمیت کو کم نہیں کرنا چاہتا لیکن سمجھنا یہ چاہتا ہوں کہ ادب و شعر ہماری عمارتِ ملی کی بنیادیں نہیں ہیں۔ محض تزئین و آرائش کی چیزیں ہیں۔ جب کسی عمارت کی بنیادیں خطرہ میں ہوں تو کوئی صاحبِ دانش و بینش اس وقت اپنی کوششیں اس کی تحسین و تزئین میں صرف نہیں کرتا بلکہ سب سے مقدم کام خود عمارت کے استحکام کو سمجھتا ہے۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ جب ہم اس تبدیلی کا اعلان کریں گے تو اطراف و جوانب سے ہم پر انگلیاں اٹھیں گی۔ لیکن بقول مولانا حالیؔ "دلفریب لگونکی باتوں پر آفریں سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفریں سننی بہتر ہے۔

آخری گزارش

آپ نے دیکھ لیا کہ اس "تحریکِ آزادی" میں آپ کے لیے کیسی کیسی خوبصورت "زنجیریں" تیار ہو رہی ہیں اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں کہ یہ زنجیریں کیا کریں گی، تو ہندوستان کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالیے یہاں یونانی آئے، پارتھین آئے، باختریں آئے، ہن آئے، اور متعدد قومیں یکے بعد دیگرے آئیں لیکن آج ذرا چراغ لے کر ڈھونڈو تو سہی کہ ان قوموں کا کہیں سراغ بھی ملتا ہے؟ یہ قومیں ہندوستان سے واپس نہیں گئیں۔ آخر کیا ہوئیں؟ کیوں نظر نہیں آتیں؟ اس کا جواب تاریخ یہ دیتی ہے کہ انھوں نے خود فراموشی کا جرم کیا تھا اس لیے فنا ہو گئیں۔ جب یہ ہندوستان آئی تھیں تو اپنی الگ زبان، الگ تہذیب الگ تمدن، الگ مذہب رکھتی تھیں، مگر انھوں نے اپنے امتیازی خصائص

کی حفاظت نہ کی، اپنے آپ کو اس ملک کی عام آبادی میں جذب کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ آج دنیا میں ان کا نام ونشان تک باقی نہیں ہے، صرف افسانے رہ گئے۔ کیا آپ یہی چاہتے ہیں کہ آپ کے بجائے صرف آپ کے افسانے باقی رہ جائیں ؟

اور رازِ حیات صرف اس حقیقت میں مضمر ہے کہ:۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں ÷ موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

آپ اپنا مذہب۔ اپنا تمدن۔ اپنی تہذیب۔ اپنی زبان۔ اسی صورت میں قائم رکھ سکتے ہیں کہ آپ اپنی جماعت کو بحیثیت مستقل جماعت کے قائم رکھیں۔ وفیھا ایات لقوم یعقلون۞

(نوٹ: یہ مضمون علیحدہ رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہو رہا ہے۔ قیمت چھ پیسہ علاوہ محصولڈاک

معارف القرآن

چونکہ زیر نظر رسالہ میں مسئلہ زبان پر ایک اہم اور بسیط مضمون شائع ہو رہا ہے اس لیے معارف القرآن کا سلسلہ جبری طور پر روکنا پڑا۔ انشاء اللہ آئندہ نمبر میں یہ سلسلہ نظر افروز ہوگا اسی طرح جناب پرویز صاحب کا ایک خاص مضمون "پیام اقبال اور قرآن کریم" بھی اسی وجہ سے شائع نہ ہو سکا۔ آئندہ یہ مضمون بھی انشاء اللہ قارئین کرام کی نظر سے گزرے گا۔

(منیجر)

ضروری تصحیح

طلوع اسلام بابت ماہ ستمبر میں صـ۲۵ سطر ۱ پر عبارت "ہندو مسلمانوں کے نزدیک بدیشی حکومت کے خاتمہ کی ضرورت اسلیے ہے"۔ میں لفظ "ہندو" زائد ہے۔ جس سے عبارت کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو گیا ہے، براہ کرم ناظرین کرام اپنے اپنے پرچوں میں اس کی تصحیح فرمالیں اور اس سے لفظ "ہندو" کو قلم زد کر دیں۔

(منیجر)

سوراجی اسلام

سیاسیاتِ حاضرہ پر مکمل اور جامع تبصرہ۔ مذہب اور سیاست کا باہمی تعلق اور اس کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر۔ اسلام میں جماعت کی اہمیت، اسلامی نظام پر مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات اور اہتلال کا دورِ اوّل۔ کانگریس کے نزدیک مذہب کی آزادی اور کانگریسیوں کے خطرناک خیالات۔ موجودہ سیاسی ماحول میں مسلمانوں کے زندہ رہنے کا طریقہ۔ اسلامی قومیت۔ اور کانگریسی قومیت کا فرق۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالات دربارہ اسلامی قومیت اور اس پر زبردست تنقید۔

ان مضامین پر اگر آپ مطلع ہونا چاہتے ہیں تو رسالہ "سوراجی اسلام"۔ از جناب راوی ملاحظہ فرمایئے۔ یہ مضمون "طلوعِ اسلام" بابت جون ۳۸ء میں شائع ہوا ہے مگر مضمون کی اہمیت اور احباب کے تقاضوں سے مجبور ہو کر بہت سے اضافوں کے ساتھ از سرِ نو اسکو علیحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اُسے خود پڑھیں اور اپنے بھائیوں تک اس پیغام کو پہونچائیں۔ صفحات ۴۸ ۔ قیمت ۲ر علاوہ محصول ڈاک

ایک رسالہ کے لئے ایک آنہ محصول ارسال فرمایئے۔

مینجر رسالہ طلوعِ اسلام بلیماران دہلی

(نوٹ) خریداران رسالہ ہذا کو چاہئے کہ خط و کتابت کرتے وقت اپنا پورا پتہ صاف اور خوشخط تحریر فرمائیں:۔

مینجر

انفاق فی سبیل اللہ

اسلام میں مسئلہ زکوٰۃ وصدقات کی اہمیت کیا ہے؟ دنیا کے معاشی نظام پر اس نے کیا اثر ڈالا۔ اور اس فریضہ کی تعمیل ازسرِنو مسلمانوں کو پھر کس طرح زندہ بنا سکتی ہے؟ نیز قرآن حکیم نے پر حکمت انداز میں اُسکے مصارف اُسکے نتائج اور اُسکے فوائد پر کس طرح روشنی ڈالی ہے؟

اگر آپ

ان تمام امور پر حاوی ہونا چاہتے ہیں تو رسالہ "انفاق فی سبیل اللہ" ملاحظہ فرمایئے۔ یہ رسالہ مشہور متکلم اسلام جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز کے حقیقت نگار قلم سے حال ہی میں نکلا ہے اور ایک دردمند ایثار پیشہ بزرگ محترم خان محمد اکبر خاں صاحب کیمبلپور نے اس کو چھپوا کر مفت شائع کیا ہے۔

طباعت میں تاخیر ہونے کے باعث درخواست کنندوں کو قدرے دقت محسوس ہوئی ہوگی مگر اب رسالہ مکمل ہو گیا ہے۔

ایک آنہ کے ٹکٹ کے بھیجکر پتۂ ذیل سے طلب فرمایئے۔

خان محمد اکبر خان صاحب ارشد منزل کیمبلپور ضلع اٹک

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار۔ دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

۵- قوانین جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دوسرے مذاہب میں۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید۔ بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ۔ قیمت مجلد ۶ غیر مجلد للعہ

رسالۂ دینیات یہ رسالہ سرکار آصفیہ کے محکمۂ تعلیمات نے میٹرک کے طلبہ کو پڑھانے کیلئے لکھوایا ہے۔ اور علمائے دکن کی ایک مستند مجلس اسکی تالیف میں شریک مشورہ رہی ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصول شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علماء بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۱ر معہ محصول ڈاک

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے

دار الاسلام نزد پٹھان کوٹ (پنجاب)